الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ہاتھی کی خاموشی ——————
کتّے کی ہزار بھونک کے اوپر بھاری ہے

فروری ۱۹۸۹

شمارہ ۱۴۷

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name .....

Address .....

.....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Name .....

Address .....

.....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۷ فروری ۱۹۸۹

فہرست

خاموشی کی طاقت	صفحہ ۲	اپنے لیے کچھ دوسرے کے لیے کچھ	صفحہ ۱۲
تین منٹ	۳	تیر بہدف نسخہ	۱۳
کامیابی کا ٹکٹ	۴	ذہنی فاصلہ	۲۰
محرومی کے بعد بھی	۵	قال اللہ قال الرسول	۲۲
پہلا قدم	۶	خدائی نشان	۲۴
زبان کی طاقت	۷	بے خبری	۲۷
مجرم کون	۸	ایک سفر	۲۹
نادر مثال	۹	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۵
خلافِ زمانہ حرکت	۱۱	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

خاموشی کی طاقت

حضرت عمر فاروق رضؓ کا ایک بہت بامعنی قول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ باطل کو مارو اس کی طرف سے چپ رہ کر (امیتوا الباطل بالصمت عنہ)

الوعی الاسلامی، کویت، جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ، جنوری ۱۹۸۷ء

یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات شر اور باطل کے بارہ میں خاموش رہ جانا اور اس کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہ کرنا ہی اس کو ختم کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس صمت عن الباطل کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ محض ذاتی بغض کی بنا پر آپ کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلاتے ہیں اور بیہودہ مضامین شائع کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر آپ ان کا جواب دیں تو آپ صرف اپنا وقت ضائع کریں گے۔ ایسی باتوں کا بہترین جواب یہ ہے کہ ان کا جواب نہ دیا جائے۔ قدیم مثل ہے کہ "کتے بھونکتے رہتے ہیں، ہاتھی چلتا رہتا ہے"۔ آپ "ہاتھی" والا کردار ادا کیجئے، نشر پسندوں کے چھیڑے ہوئے فتنے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

ایک شخص آپ کے اوپر کیچڑ پھینکتا ہے۔ آپ کے گھر میں گندگی ڈال دیتا ہے۔ اب اگر آپ مشتعل ہو کر اس سے لڑنے لگیں تو آپ نے اس کے مقصد کو پورا کیا۔ آپ کی اشتعال انگیز کارروائی اس کو مزید موقع دے گی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے آپ کے خلاف مکمل فساد برپا کر دے گا۔ لیکن اگر آپ اس کی اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہوں تو گویا آپ نے اس کے بم کو ناکارہ کر دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وہی بات ایک اور انداز سے فرمائی ہے جس کو قرآن میں اعراض کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اعراض کا مطلب ہے اگنور کرنا، نظر انداز کرنا۔ اعراض محض ایک سلبی فعل نہیں وہ ایک ایجابی کارروائی ہے۔ وہ خود ایک طاقت ور عمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں نظر انداز کرنا دفع شر کی سب سے زیادہ موثر تدبیر ہوتی ہے۔ جہاں سب سے بڑی کارروائی یہ ہوتی ہے کہ سرے سے کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

تین منٹ

۹ ستمبر ۱۹۸۸ کا واقعہ ہے۔ ویت نام ایر لائنز کا ایک روسی ساخت کا ہوائی جہاز ہنوئی سے اڑا۔ اس کی پہلی منزل بینکاک تھی جہاں اس کو ڈون مونگ (Don Muang) ایرپورٹ پر اترنا تھا۔ اس جہاز میں عملہ کے پانچ افراد سمیت کل ۸۱ مسافر تھے جن میں گیارہ ہندستانی باشندے شامل تھے۔

جہاز بینکاک کے قریب پہنچ کر نیچے آنے لگا۔ انا ؤنسر نے اعلان کیا کہ تھوڑی دیر کے بعد ہمارا جہاز بینکاک کے ہوائی اڈہ پر اترے گا۔ جن مسافروں کی منزل بینکاک تھی، ان کے چہروں پر ایک نئی روشنی چمک اٹھی۔ ہر ایک چشم تصور میں ان لوگوں کو دیکھنے لگا جو ہوائی اڈہ پر مسکراتے ہوئے چہرہ کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے ذہن میں اپنے اس گھر کا نقشہ آگیا جہاں پہنچ کر وہ اپنے لوگوں کے درمیان خوشی اور سکون کے لمحات حاصل کرے گا۔

یہ دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ اس وقت بینکاک میں شدید بارش ہو رہی تھی۔ جہاز کو ہوائی اڈہ تک پہنچنے میں صرف تین منٹ باقی تھے کہ زبردست کڑک چمک ہوئی۔ ایک چشم دید گواہ نے بتایا کہ عین اس وقت جہاز پر بجلی گر پڑی جب کہ وہ بینکاک ایرپورٹ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جہاز میں فوراً آگ لگ گئی۔ وہ ہوائی اڈہ کے قریب دھان کے کھیت میں گر پڑا۔ جہاز کے ۷۵ مسافر اسی وقت ہلاک ہوگئے۔ چھ مسافر جھلسی ہوئی حالت میں زندہ بچے جو اس وقت اسپتال میں زیر علاج ہیں (ہندستان ٹائمس ۱۱ ستمبر ۱۹۸۸)

اس طرح کے واقعات در اصل خدا کی نشانی ہیں۔ وہ چند آدمیوں کی مثال کی روشنی میں تمام آدمیوں کا حال بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو انجام "بینکاک" کے مسافروں کا ہوا، وہی انجام تمام انسانوں کا ہونے والا ہے۔ ہر آدمی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آنے والا ہے کہ اس کے "جہاز" پر عین اس وقت موت کی بجلی گر پڑے جب کہ وہ اپنی منزل سے صرف تین منٹ کے فاصلہ پر ہو۔

کامیابی کا ٹکٹ

موجودہ زمانہ میں کامیابی حاصل کرنے کی سب سے زیادہ یقینی تدبیر تعلیم ہے۔ جن لوگوں نے اس راز کو جان لیا ہے وہ اس سے زبردست فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

۱۔ امریکہ میں ہر سال ایک تعلیمی مقابلہ ہوتا ہے جس میں پورے ملک کے طلبہ شریک ہوتے ہیں۔ اس میں امریکہ کے چھ ممتاز سائنسی طلبہ (Top 6 science students) کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۷ میں جب اس قسم کے چھ ممتاز ترین امریکی طلبہ کا انتخاب کیا گیا تو اس میں ایک ہندستانی لڑکی کیشانی بھوشن کا نام بھی شامل تھا۔ اس کو بالڈون کالج (Mary Baldwin College) سے ایک ہزار ڈالر ماہانہ کا وظیفہ دیا جائے گا (ہندستان ٹائمس ۳۰ اگست ۱۹۸۷)

۲۔ دہلی کے ۲۱ مارچ کے اخبارات میں ایک خبر تھی۔ انڈین اکسپریس (۲۱ مارچ ۱۹۸۸) نے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا تھا کہ ہندستانی لڑکا امریکہ کے سائنسی مقابلہ میں ٹاپ کرتا ہے:

Indian boy tops in US science competition

۳۔ امریکہ میں مختلف قسم کے سائنسی مقابلے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک خاص مقابلہ وہ ہے جس کو ویسٹنگ ہاؤس سائنسی صلاحیت جانچ (Westinghouse Science Talent Search) کہا جاتا ہے۔ ۱۹۸۸ میں اس کا ۴۷ واں سالانہ مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں جو طالب علم اول آیا وہ ایک ہندستانی طالب علم تھا جس کا نام چیتن نانک ہے۔ اس کو ۲۰ ہزار ڈالر سالانہ تعلیمی وظیفہ دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی مزید تعلیم بحسن وخوبی جاری رکھ سکے۔ ماضی میں ویسٹنگ ہاؤس مقابلہ میں کامیاب ہونے والے پانچ طالب علموں نے بعد کو نوبیل انعام حاصل کیا۔

تعلیم موجودہ زمانہ میں کامیابی کا ٹکٹ (Ticket to success) ہے۔ تعلیم کے ڈگری والے نظام نے کامیابی کے اس زینہ کو ہر آدمی کے دروازہ تک پہونچا دیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ محنت ہے۔ آدمی اگر محنت اور دانش مندی کے ساتھ اس امکان کو استعمال کرے تو ہر جگہ وہ اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کر سکتا ہے، خواہ وہ امریکہ ہو یا ہندستان یا اور کوئی ملک۔

محرومی کے بعد بھی

الرسالہ (دسمبر ۱۹۸۸) میں کناڈا کے کھلاڑی بن جانسن (Ben Johnson) کا قصہ چھپ چکا ہے۔ دوڑ کے عالمی مقابلہ میں اس نے اول درجہ کی کامیابی حاصل کی۔ مگر اگلے ہی دن اس کا جیتا ہوا گولڈ میڈل اس سے چھین لیا گیا۔ مزید اس کے بارہ میں یہ سخت فیصلہ کیا گیا کہ وہ اگلے دو سال تک کھیل کے مقابلوں میں حصہ نہ لے سکے گا۔ بن جانسن کے لیے یہ اس کی زندگی کا شدید ترین حادثہ تھا۔ تاہم اس نے "ظالم ججوں" کے خلاف احتجاج میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے از سر نو اپنی تیاری کا منصوبہ بنایا۔

اٹلی کے ٹیلی وژن نیٹ ورک نے نومبر ۱۹۸۸ میں بن جانسن کا ایک باتصویر انٹرویو اس کی رہائش گاہ (ٹورانٹو) پر لیا جس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ نومبر ۱۹۸۸) کے مطابق، ایک سو میٹر دوڑ کے عالمی چیمپین بن جانسن نے ٹیلی وژن کیمرہ کے سامنے روتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جان بوجھ کر کھیل کے اصولوں کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ تاہم وہ اپنی تیاری جاری رکھے ہوئے ہیں اور وہ بارسلونہ (اسپین) میں ۱۹۹۲ میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں واپس آنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کا عالمی ریکارڈ ٹریک پر ۱۳ سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ تھا۔ بظاہر وہ بہت افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ سیول اولمپک کے بعد پیش آنے والے مشکل لمحات کا ذکر کرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ انٹرویو لینے والے مسٹر گیانی منولی (Gianni Minoli) نے کہا کہ شوٹنگ کا کام پانچ منٹ تک روک دینا پڑا۔ کیوں کہ بن جانسن اپنی سسکیوں پر قابو نہیں پا سکے تھے۔

بن جانسن نے بتایا کہ ٹریک پر واپس آنے کے لیے وہ ہفتہ میں چھ دن چار گھنٹہ روزانہ ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آجکل میرا کام صرف دوڑنا ہے۔ بیٹھے رہنے کی بات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ مقابلہ میں حصہ لوں۔ انھوں نے میرا سونے کا تمغہ مجھ سے لیا ہے نہ کہ میری رفتار:

They have taken away my gold medal, not my speed.

چھیننے والا ہمیشہ آپ کی کوئی چیز چھینتا ہے نہ کہ خود آپ کو۔ آپ کا وجود اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ پھر بھی آپ کو حاصل رہتا ہے۔ اس حاصل شدہ متاع کو استعمال کیجیے، اور پھر ہر محرومی کے بعد آپ اپنی ایک نئی تاریخ بنا سکتے ہیں۔

پہلا قدم

نیل آرم اسٹرانگ پہلے شخص ہیں جنھوں نے چاند کا سفر کیا۔ ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ کو انھوں نے ایگل نامی چاند گاڑی سے اتر کر چاند کی سطح پر اپنا قدم رکھا۔ اس وقت زمین اور چاند کے درمیان برابر موا صلاتی ربط قائم تھا۔ چاند پر اترنے کے بعد انھوں نے زمین والوں کو جو پہلا پیغام دیا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کے اعتبار سے یہ ایک چھوٹا قدم ہے، مگر انسانیت کے لئے یہ ایک عظیم چھلانگ ہے:

That's one small step for man, but one giant leap for mankind.

آرم اسٹرانگ کا مطلب یہ تھا کہ میرا اس وقت چاند پر اترنا بظاہر صرف ایک شخص کا چاند پر اترنا ہے۔ مگر وہ ایک نئے کائناتی دور کا آغاز ہے۔ ایک شخص کے بحفاظت چاند پر اترنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسان کے لئے چاند کا سفر ممکن ہے۔ یہ دریافت آئندہ آگے بڑھے گی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب کہ عام لوگ ایک سیارہ سے دوسرے سیارہ تک اسی طرح سفر کرنے لگیں جس طرح وہ موجودہ زمین کے اوپر کرتے ہیں۔

ہر بڑا کام موجودہ دنیا میں اسی طرح ہوتا ہے۔ ابتداءً ایک فرد یا چند افراد قربانی دے کر ایک دریافت تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح وہ انسانی سفر کے لئے ایک ہموار راستہ کھولتے ہیں۔ یہ ابتدائی کام بلاشبہہ انتہائی مشکل ہے۔ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانے کے ہم معنی ہے۔ مگر جب یہ ابتدائی کام ہو جاتا ہے تو اس کے بعد سارا معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ اب ایک ایسا کشادہ راستہ لوگوں کے سامنے آجاتا ہے کہ انسانی قافلے بڑی تعداد میں اس پر سفر کر سکیں۔

کسان جب زمین میں ایک بیج ڈالتا ہے تو وہ گویا زراعت کی طرف ایک "چھوٹا قدم" ہوتا ہے تاہم اس چھوٹے قدم کے ساتھ ہی کسان کے زرعی سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ سفر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے کہ اس کے کھیت میں ایک پوری فصل کھڑی ہوئی نظر آئے۔ یہی طریقہ تمام انسانی معاملات کے لئے درست ہے، خواہ وہ زراعت اور باغبانی کا معاملہ ہو یا اور کوئی معاملہ۔

زبان کی طاقت

المتنبی (۳۵۴-۳۰۳ھ) مشہور عرب شاعر ہے۔ وہ کوفہ میں پیدا ہوا۔ اور بغداد میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک شعر ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ تمہارے پاس اگر گھوڑا اور مال نہیں ہے جس کو تم اپنے محبوب کو ہدیہ کر سکو، تو تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا حال اگر تمہارا ساتھ نہیں دیتا تو تمہاری گویائی تمہارا ساتھ دے گی :

لَا خَيلَ عِندَكَ تُهدِيهَا وَلَامَالُ فَلْيُسعِدِ النُّطقُ إِن لَم تُسعِدِ الحَالُ

گویائی (نطق) اللہ تعالیٰ کی بڑی عجیب نعمت ہے۔ یہ انسان کے پاس ایک ایسی طاقت ہے جو ہر دوسری طاقت پر بھاری ثابت ہوتی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ دولت سے زیادہ قیمتی ہے اور ہتھیار سے زیادہ موثر۔ اس کے ذریعہ مفتوح اپنے فاتح کو جھکا سکتا ہے اور مغلوب اپنے غالب کو زیر کر لیتا ہے۔

حافظ حامد حسن علوی (۱۸۷۲-۱۹۵۹) نہایت ذہین آدمی تھے۔ گفتگو میں کوئی شخص ان کے مقابلہ میں ٹک نہیں سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ پر جلال شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے بتایا کہ زندگی میں صرف ایک بار ایسا ہوا ہے کہ میں کسی شخص کے مقابلہ میں بالکل لاجواب ہو گیا۔ اس کا ایک فقرہ میری ساری ذہانت پر بھاری ثابت ہو گیا اور میرے لیے چپ ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

حافظ حامد حسن علوی کچھ معزز لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک فقیر عورت آگئی۔ اس نے کہا "بابا کچھ دیدے" وہ لوگ متوجہ نہیں ہوئے تو عورت نے اپنے سوال کو کئی بار دہرایا۔ حافظ صاحب مرحوم کو عورت کا بار بار سوال کرنا گفتگو میں بے جا مداخلت محسوس ہوا۔ انھوں نے کسی قدر خفگی کے ساتھ کہا : بہت بیوقوف ہے۔ اس کے بعد عورت نے کہا : "ہاں بابا، غریب بیوقوف ہی ہوتا ہے" یہ کہہ کر عورت چلی گئی۔ حافظ صاحب مرحوم اس کے جملہ کی تاب نہ لاکر خاموش ہو گیے۔ اس کے بعد وہ اس مجلس میں کچھ بول نہ سکے۔ بعد کو انھوں نے کہا : اب تک کوئی شخص مجھے لاجواب نہ کر سکا تھا، اس غریب عورت نے مجھے لاجواب کر دیا۔

آپ کے پاس اگر کچھ نہ ہو، تب بھی آپ کے پاس ایک چیز ہے۔ اور وہ خدا کی دی ہوئی قوت گویائی ہے، اپنی گویائی کو استعمال کیجیے۔ اس بے کچھ سے آپ اپنے لیے سب کچھ پا سکتے ہیں۔

مجرم کون

ایک آدمی کو گلاب کا پھول توڑنا تھا۔ وہ شوق کے تحت تیزی سے لپک کر اس کے پاس پہونچا اور جھٹکے کے ساتھ ایک پھول توڑ لیا۔ پھول تو اس کے ہاتھ میں آگیا، مگر تیزی کے نتیجہ میں کئی کانٹے اس کے ہاتھ میں چبھ چکے تھے۔ اس کے ساتھی نے کہا کہ تم نے بڑی حماقت کی۔ تم کو چاہئے تھا کہ کانٹوں سے بچتے ہوئے احتیاط کے ساتھ پھول توڑو۔ تم نے احتیاط والا کام بے احتیاطی کے ساتھ کیا اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ تمہارا ہاتھ زخمی ہوگیا۔

اب پھول توڑنے والا غصہ ہوگیا۔ اس نے کہا کہ سارا قصور تو ان کانٹوں کا ہے۔ انھوں نے میری ہتھیلی کو اور میری انگلیوں کو خون آلود کیا، اور تم اُلٹا مجھ کو مجرم ٹھہرا رہے ہو۔ اس کا ساتھی بولا: میرے دوست، یہ درخت کے کانٹوں کا معاملہ نہیں، یہ نظامِ قدرت کا معاملہ ہے۔ قدرت نے دنیا کا نظام اسی طرح بنایا ہے کہ یہاں پھول کے ساتھ کانٹے ہوں۔ میری اور تمہاری چیخ پکار ایسا نہیں کر سکتی کہ اس نظام کو بدل دے۔ پھول کے ساتھ کانٹے کا یہ نظام تو بہر حال اسی طرح دنیا میں رہے گا۔ اب میری اور تمہاری کامیابی اس میں ہے کہ ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے بچنے کی تدبیر تلاش کریں۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ کانٹوں سے بچ کر پھول کو حاصل کریں۔ کانٹوں میں نہ الجھتے ہوئے پھول تک پہونچنے کی کوشش کریں۔

پھول کے ساتھ کانٹے کا ہونا کوئی سادہ بات نہیں، یہ فطرت کی زبان میں انسان کے لیے سبق ہے۔ یہ نباتاتی واقعہ کی زبان میں انسانی حقیقت کا اعلان ہے۔ یہ اس تخلیقی منصوبہ کا تعارف ہے۔ جس کے مطابق موجودہ دنیا کو بنایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں وہی اقدام کامیاب ہوتا ہے جو اعراض کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے بنایا گیا ہو۔

جہاں بچنے کی ضرورت ہو وہاں الجھنا، جہاں تدبیر کی ضرورت ہو وہاں ایجی ٹیشن کرنا صرف اپنی نالائقی کا اعلان کرنا ہے۔ خدا نے جس موقع پر اعراض کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہو، وہاں اُلجھنے کا طریقہ اختیار کرنا خود اپنے آپ کو مجرم بنانا ہے، خواہ آدمی نے دوسروں کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ڈکشنری کے تمام الفاظ دہرا ڈالے ہوں۔

نادر مثال

انگریزی ہفت روزہ گارجین میں ایک خبر چھپی ہے جس کا عنوان ہے ——— ایک ریاضی داں جس نے ایک لاکھ پچاس ہزار پاؤنڈ کے انعام کو رد کر دیا:

The mathematician who turned down a £150,000 prize

فرانس کے ریاضی کے داں الگزنڈر گراتھنڈیک (Alexandere Grothendieck) جن کو اس سے پہلے متعدد سائنسی اعزازات مل چکے ہیں، ۱۹۸۶ میں انھیں سویڈن کی رائل اکاڈمی نے کرافورڈ انعام (Crafoord prize) انعام دیا جو نوبل انعام کے برابر معزز سمجھا جاتا ہے۔ اس اعزاز کے ساتھ ایک لاکھ پچاس ہزار پاؤنڈ (تقریباً ۳۷ لاکھ روپیہ) کی رقم بھی شامل تھی۔ مگر فرانسیسی سائنسداں نے اس انعام کو لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے انکاری خط میں اس کا تین سبب بتایا ہے۔ اول یہ کہ مالی اعتبار سے مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں۔ دوسرے یہ کہ انعام کے اس طریقے سے مجھے اتفاق نہیں کہ غیر مشہور لوگوں کو نظر انداز کر کے صرف کچھ مشہور لوگوں کو اعزازات دئے جاتے رہیں۔ تیسری وجہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

The work which has earned for me the Royal Academy's kindly attention goes back 25 years to a period when I was part of the scientific community. I quit this community in 1970. Now in the past two decades, the ethics of the scientific profession have become so degraded that wholesale plundering of ideas has become almost the general rule among scientists. It is at any rate tolerated by all, including the most glaring and iniquitous cases. Under the circumstances, agreeing to play along with the practice of granting prizes and rewards would also be endorsing a spirit and a development in the scientific world that I see as deeply unhealthy. It is this third reason which in my view is by far the most serious.

Guardian Weekly, Manchester, May 15, 1988

وہ تحقیق جس نے مجھے رائل اکیڈمی کی عنایت سے سرفراز کیا ہے، وہ ۲۵ سال پہلے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وقت میں سائنٹفک کمیونٹی کا ایک حصہ تھا۔ میں نے اس کمیونٹی کو ۱۹۷۰ میں چھوڑ دیا۔ اب پچھلے ۲۰ برسوں میں سائنسی پیشہ کی اخلاقیات میں اتنا زیادہ تنزل آچکا ہے کہ افکار کی قزاقی اب سائنس دانوں کے درمیان تقریباً عام بات ہے۔ اس صورتحال کو آج تمام لوگ برداشت کر رہے ہیں۔

حتی کہ بے انصافی کے انتہائی کھلے ہوئے واقعات میں بھی۔ ان حالات میں انعام دینے کے عمل میں شرکت پر راضی ہونا، سائنسی دنیا میں ہونے والے ایک ایسے عمل کی تصدیق کرنا ہے جس کو میں بہت زیادہ غیر صحت مند سمجھتا ہوں۔ یہی تیسری چیز ہے جو میری نظر میں سب سے زیادہ سنگین ہے۔

انعام کی رقم کو اپنی ذات کے لئے نہ لینا بجائے خود کوئی بہت بڑا واقعہ نہیں۔ موجودہ زمانہ میں اس طرح کے واقعات کثرت سے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مدر ٹریسا کو بہت سے بڑے بڑے مالی انعام بشمول نوبل انعام ملے۔ مگر انھوں نے ان تمام انعامات کو معذوروں کے ادارہ کو دے دیا۔

مگر فرانسیسی سائنس داں نے جس چیز کا ثبوت دیا ہے وہ انتہائی نادر ہے۔ یہ اصول پسندی کی خاطر خود اپنی کمیونٹی کا ناقد بننا ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کسی نہ کسی گروہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس گروہ کے لوگوں میں بے اصولیاں دیکھتا ہے مگر وہ ان پر گرفت نہیں کرتا۔ وہ ان کو غلط جانتے ہوئے انھیں برداشت کرتا رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنے کے بعد میں اپنے گروہ سے کٹ جاؤں گا۔ اور اپنے گروہ سے کٹنا اس دنیا میں اپنے آپ کو بے زمین بنا لینا ہے۔

یہ اصول پسندی کی اعلیٰ ترین قسم ہے کہ آدمی اپنے گروہ کی غلطیوں پر چپ نہ رہ سکے۔ حتی کہ اپنی اس اصولی حیثیت کی حفاظت کے لئے وہ اپنے گروہ کی طرف سے ملنے والے مفادات سے اپنے آپ کو محروم کر لے۔

ایسے لوگ آپ کو بے شمار ملیں گے جو غیر کمیونٹی کے خلاف بولنے کے مجاہد بنے ہوئے ہوں۔ مگر وہ شخص کہیں نظر نہیں آتا جو خود اپنی کمیونٹی کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کرے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ غیر کمیونٹی کے خلاف لسانی جہاد کرنے سے لیڈری ملتی ہے۔ جب کہ اپنی کمیونٹی کے خلاف لسانی جہاد کرنے والا اپنے ماحول میں نکو بن جاتا ہے۔ وہ ملی ہوئی قیادت کو بھی کھو دیتا ہے۔

الرسالہ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات کا بک اسٹال
حیدر آباد کی صنعتی نمائش میں
اسٹال نمبر ۴۱۶، جھولوں کے قریب، نمائش میدان، حیدر آباد
زیر اہتمام: الرسالہ اکیڈمی، حیدر آباد

خلافِ زمانہ تحریک

انگریز جب انیسویں صدی میں ہندستان آئے، اس وقت یہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ انگریزوں نے طے کیا کہ فارسی کے بجائے انگریزی کو یہاں کی سرکاری زبان بنائیں۔ وہ اپنے فیصلہ میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ انگریزی نے نہ صرف سرکاری زبان کی جگہ لے لی، بلکہ یہی زبان پورے برصغیر ہند میں عوامی رابطہ کی زبان بن گئی۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا تو ملک کے لیڈروں نے اعلان کیا کہ آزاد ہندستان کی سرکاری زبان ہندی ہوگی۔ حتی کہ انھوں نے نئے ہندستان کے لیے جو دستور بنایا، اس میں ایک باضابطہ دفعہ کے تحت یہ طے کر دیا کہ پندرہ سال کے بعد انگریزی کو ختم کر کے ہندی کو دیوناگری رسم خط میں ملک کی قومی اور سرکاری زبان بنا دیا جائے گا۔ مگر آزاد ہندستان کے لیڈروں کو اس میں مکمل ناکامی ہوئی۔ آج بھی انگریزی زبان پوری قوت کے ساتھ ملک میں رائج ہے۔ وہ بدستور پورے ملک میں عوامی رابطہ کی زبان بنی ہوئی ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ برٹش راج ایک شاہی راج تھا، ہندستان کا موجودہ راج ایک عوامی راج ہے۔ آج جو کچھ ہوتا ہے عوام کے چاہنے سے ہوتا ہے۔ عوام نے انگریزی کو ختم کرنا نہ چاہا، اس لیے قانون سازی کے باوجود انگریزی اس ملک سے ختم نہ ہو سکی۔

ملک کے سیاسی نظام میں یہ ایک بنیادی تبدیلی تھی جو آزادی کے بعد پیش آئی۔ مگر ہمارے تمام لیڈر، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش، اس حقیقت سے بالکل بے خبر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پچھلی نصف صدی سے اپنی ساری قیادتی دوڑ حکمرانوں کی طرف لگائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک قسم کی خلافِ زمانہ حرکت (Anachronism) ہے۔ وہ عملاً دورِ عوام میں ہیں، مگر اپنی سوچ کے اعتبار سے وہ ابھی تک دورِ بادشاہی میں جی رہے ہیں۔ قدیم زمانہ کی طرح اب بھی وہ یہی سمجھتے ہیں کہ تمام مسائل حکمرانوں کے حل کرنے سے حل ہوں گے۔ حالاں کہ یہ صرف تاریخ اور سیاست سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ اگر وہ تاریخ کی تبدیلیوں کو جانتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ آج عوامی سیاست کا دور ہے، آج مسائل کا سرچشمہ عوام ہیں نہ کہ حکمراں۔

مسلم رہنما اگر اس راز کو پالیتے تو وہ اپنی کوششوں کا رخ اکثریتی عوام کی طرف کر دیتے۔ مگر اس حقیقت سے بے خبری کی بنا پر وہ صرف حکمرانوں کی طرف دوڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار کوششوں اور قربانیوں کے باوجود آج تک مسلمانوں کے مسائل میں سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔

اپنے لیے کچھ دوسرے کے لیے کچھ

ایک صاحب نے کہا کہ آپ الرسالہ میں مسلمانوں کو بزدلی اور پسپائی کا سبق دے رہے ہیں۔ حالاں کہ اسلام نے جہاد و قتال کی تعلیم دی ہے۔ انھوں نے پرجوش طور پر بولتے ہوئے کہا: شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سال کی زندگی سے بہتر ہے۔

میں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں مسلمان قرآن کے جس حکم کے مخاطب ہیں وہ صبر و اعراض ہے۔ اسی لیے میں خود اس پر عامل ہوں اور مسلمانوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہوں۔ آپ کا خیال ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیے جہاد و قتال کا وقت ہے تو پھر اس کار ثواب میں آپ کیوں نہیں شریک ہو جاتے۔ آپ کے خیال کے مطابق، آج ساری دنیا میں بہت سے جہاد کے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ پھر بسم اللہ کر کے ان میں سے کسی میدان میں کود پڑیئے۔ اور لڑ کر شہید ہو جائیے۔

انھوں نے کہا کہ میں نے ایک ادارہ قائم کیا ہے اور اس کے تحت اصلاحی تقریریں کر رہا ہوں، کیا یہ جہاد نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ خود تو تقریر کے میدان میں جہاد کر رہے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو جنگ و قتال کے میدان میں جہاد کے لیے اتارنا چاہتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام مسلم رہنما قول و عمل کے اسی تضاد میں مبتلا ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود زبان چلائیں گے اور دوسرے مسلمانوں سے کہیں گے کہ تم تلوار چلاؤ۔ خود اپنے بچوں کو کانونٹ میں پڑھائیں گے اور دوسری طرف بیانات شائع کریں گے کہ جامعہ ملیہ ایکٹ (۱۹۸۸) میں جامعہ کے اسلامی کردار کو ختم کر دیا گیا ہے۔ خود اپنے معاملات ایڈجسٹمنٹ کے ذریعہ حل کریں گے اور مسلمانوں سے کہیں گے کہ تم خدائی فوجدار ہو اس لیے جہاں اپنے خلاف کوئی بات دیکھو لڑ جاؤ۔ اپنی ذاتی زندگی میں عدل و انصاف پر قائم نہ ہوں گے اور نعرہ لگائیں گے کہ ساری دنیا میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرو۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کو ذوالقلبین اور ذوالوجہین کہا گیا ہے۔ اردو زبان میں اس کو دوعملی کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا کردار اللہ کی نظر میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا تمہارا یہ حال ہے کہ تم لوگوں سے نیک کام کرنے کے لیے کہتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالاں کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم سمجھتے نہیں (البقرہ ۴۴)

تیر بہدف نسخہ

بابری مسجد تحریک کی نام نہاد قیادت نے پرجوش تقریروں کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے ۱۲ر اگست ۱۹۸۸ کو "قائدین کا مارچ" ہوگا۔ وہ فیض آباد سے چل کر اجودھیا پہونچیں گے اور بابری مسجد میں فاتحانہ داخل ہو کر جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ اس اعلان کا ردعمل فریق ثانی پر ہوا۔ اور ہندو فرقہ پرست تنظیمیں پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ مسلم قائدین نے اگر مذکورہ تاریخ کو اجودھیا مارچ کیا تو ہم سوگنا طاقت کے ساتھ ان کی طرف مارچ کریں گے۔ پہلے بظاہر یہ دکھائی دیتا تھا کہ اجودھیا کی طرف مارچ قیادت کی طرف مارچ ہے۔ مگر بعد کو نظر آیا کہ اجودھیا مارچ قبرستان کی طرف مارچ ثابت ہوگا۔ چنانچہ نام نہاد قائدین نے ایک عذر نکال کر مارچ کو ملتوی کر دیا۔

اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ یہ مارچ ضرور ہوگا اور اب اس کی تاریخ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ ہے۔ بار بار اعلان کیا گیا کہ مارچ مذکورہ تاریخ کو ہو کر رہے گا۔ کسی بھی وجہ سے وہ رکنے والا نہیں۔ مگر اس کے بعد انتہا پسند ہندو عناصر نے اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ مجوزہ اجودھیا مارچ کو نہ صرف بزور روکیں گے بلکہ وہ مارچ میں شرکت کرنے والوں کو ایسا "سبق" پڑھائیں گے کہ آئندہ وہ اس قسم کی جرأت ہی نہ کر سکیں۔ اب قائدین کو اپنے سامنے موت نظر آنے لگی۔ چنانچہ دوبارہ بالکل آخر وقت میں اس کے التوا کا اعلان کر دیا گیا ——— لفظ کا کریڈٹ لینے والے عمل کا کریڈٹ لینے میں ناکام رہے۔

اس سلسلہ میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مارچ کے بھیانک نتائج سے مسلم قائدین تو بچ گئے مگر مسلم عوام اس سے بچنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ پورے یو پی میں ان کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ نیز علی گڈھ، مظفر نگر، کھتولی اور فیض آباد وغیرہ میں باقاعدہ فسادات پھوٹ پڑے جن میں مسلمانوں کو ناقابل بیان جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک ہی مشترک خطرہ سے قائدین تحریک کس طرح مکمل طور پر بچ گئے، اور پیروانِ تحریک کیوں کر عین اسی خطرہ کا شکار ہو گئے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ قائدین کا اصول

یہ ہے کہ لفظی تقریریں کرو، مگر جب عمل کا وقت آئے تو ایک خوبصورت عذر بیان کرکے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ اس کے برعکس پیروان تحریک اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جو تقریر کی جائے اس کے مطابق عمل بھی ضرور کیا جائے۔

ایسی حالت میں میں مسلم عوام کو مشورہ دوں گا کہ وہ اپنے قائدین کی ادھوری پیروی کرنے کے بجائے ان کی مکمل پیروی کریں۔ مسلم عوام اگر چاہتے ہیں کہ جس طرح ان کے قائدین کی جان و مال پوری طرح محفوظ ہے اسی طرح ان کی اپنی جان و مال بھی پوری طرح محفوظ رہے تو اس کا نہایت سادہ حل یہ ہے کہ ـــــ قائدین کے کیے کو کرو، ان کے کہے کو بالکل نظر انداز کر دو۔

علی گڈھ کی مثال

فرقہ وارانہ فساد کی حقیقت کیا ہے اور اس سے کس طرح بچا جا سکتا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے علی گڈھ کی مثال لیجیے۔ علی گڈھ کے مسلمان قائدین تحریک کے لفظوں سے (نہ کہ عمل سے) متاثر ہو کر بابری مسجد تحریک کے مسئلہ پر زبردست جوش و خروش دکھا رہے تھے۔ اس کے جواب میں وہاں کے ہندو بھی پوری طاقت سے ابھر آئے۔ ۸ اکتوبر کو بجرنگ دل، ہندو پریشد اور رام جنم بھومی مکتی سنگھرش سمتی کی جانب سے یک روزہ علامتی ہڑتال ریاست گیر پیمانہ پر ہوئی۔ ایسے نازک مواقع پر مسلم قائدین اپنا "مارچ" ملتوی کر دیتے ہیں مگر علی گڈھ کے مسلمانوں نے اس کے برعکس اپنا "مارچ" جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ تناؤ اور اشتعال بڑھتا چلا گیا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۸۸ کو صبح ۹ بجے سے آر ایس ایس کے رضا کار اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے لیے ہوئے تمام شہر کی دکانوں کو زبردستی بند کرا رہے تھے۔ ریلوے روڈ، سبزی منڈی اور بڑا بازار میں انھوں نے مسلم اقلیت کی دکانوں کو بھی طاقت کے بل پر بند کرا دیا۔ تاہم صرف دکانوں کو بند کرانے سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بند دکانوں کے اوپر بینر لگا دیے جن پر علی گڈھ کے بجائے "ہری گڈھ" لکھا ہوا تھا۔

مسلمانوں کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ انھوں نے ان بینروں کو اپنی دکانوں سے اتار دیا۔ اب بجرنگ دل اور آر ایس ایس کے رضا کاروں کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی کارروائی کریں۔ اور مسلمانوں نے بینر اتار کر وہ کارروائی کر دی۔ چنانچہ فوراً وہ تخریب کاری پر اتر آئے۔ چند منٹوں کے اندر خنجر زنی، لوٹ مار، آتش زنی اور فائرنگ کا

ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اس فساد میں مسلمانوں کو جان و مال کا جو نقصان اٹھانا پڑا اس کی تفصیل قومی آواز کی رپورٹ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۸ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ہندو فرقہ پرستوں کے ان "کاغذی" بیزوں کو مسلمان اگر اپنی دکانوں کے اوپر سے خود نہ اتارتے تو یقینی طور ہوا کے جھونکے انھیں اتار دیتے۔ قدرت کا نظام زیادہ بہتر طور پر وہ کام کر دیتا جس کو مسلمان نہایت کم تر انداز میں انجام دینا چاہتے تھے۔ مگر مسلمان اپنی بے شعوری اور نظام خداوندی کے بارہ میں اپنی بے یقینی کی بنا پر اس کا انتظار نہ کر سکے کہ قدرت کی طاقتیں متحرک ہو کر جھنڈوں اور بیزوں کے اس کوڑے کو صاف کریں۔ انھوں نے مشتعل ہو کر خود یہ کام کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انتہائی غیر ضروری طور پر آگ اور خون کی نذر کر دیئے گئے۔

ہندستان کے فسادات کے سلسلہ میں اصل مسئلہ مسلمانوں کی یہی مشتعل مزاجی ہے نہ کہ اغیار کی اشتعال انگیزی۔ کیوں کہ مقابلہ کی اس دنیا میں اشتعال انگیزی کے واقعات تو بہر حال ہوں گے، اور وہ ہندستان ہی میں نہیں، بلکہ ہر جگہ ہوں گے، حتی کہ مسلم ملکوں میں بھی۔ ہم ان کے وجود کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو ان کے نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ اور وہ تدبیر ہے ——— اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا۔

مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی یہی بے صبری ہے۔ فریق ثانی نے اچھی طرح جان لیا ہے کہ کچھ چیزیں ہیں جن پر مسلمان فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ ہر مسلمان کا کوئی "ہری گڈھ" ہے۔ جب بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا ہو، فوراً "ہری گڑھ" کا نعرہ لگا دو۔ اس کے بعد لازماً ایسا ہوگا کہ مسلمان بھڑک اٹھیں گے اور پھر ان کے خلاف متشددانہ کارروائی کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان "ہری گڑھ" پر بھڑکنا چھوڑ دیں، اس کے بعد تمام فسادات بے زمین ہو کر اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

یقینی حل

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کا بلاشبہ یقینی حل ہے۔ مگر یہ حل "انتظامیہ" کے پاس نہیں ہے۔ یہ خود مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان جس روز اس حقیقت کو جان لیں گے، اسی دن اس ملک سے فرقہ وارانہ فسادات اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ (Competition) کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک دوڑ رہا ہے۔ ہر ایک دوسرے کا پیچھا کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں لازماً ٹکراؤ کے مواقع پیش آتے ہیں۔ مذکورہ قانون فطرت کی بنا پر وہ ہمیشہ اور ہر جگہ پیش آئیں گے خواہ وہ دسویں صدی ہو یا بیسویں صدی، خواہ وہ ہندستان ہو یا پاکستان۔ غرض کہیں بھی مقابلہ اور مسابقت کی یہ حالت ختم ہونے والی نہیں۔ ہم مقابلہ کی حالت کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم اپنے آپ کو اس کی زد سے بچا سکتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اس سے بچانے کا واحد نسخہ وہی ہے جس کو قرآن میں اعراض (Avoidance) کہا گیا ہے۔

ہندستان کے ہندو فرقہ پرستوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی ایک کمزوری دریافت کر رکھی ہے۔ یہ کمزوری ہے ان کا اشتعال کے موقع پر مشتعل ہو جانا۔ جن مواقع پر قرآنی حکم کے مطابق اعراض کرنا چاہیے وہاں دوسروں سے الجھ جانا۔ یہ گویا مسلمانوں کا کمزور مقام (Vulnerable point) ہے۔ اسی کمزور مقام سے فریق ثانی ان پر "حملہ" کرتا ہے اور مسلمانوں کی بے شعوری کی بنا پر ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔

ایک واقعہ

ایک صاحب نے ایک شہر کا واقعہ بتایا جو ۱۹۸۸ میں پیش آیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے شہر میں ہندو فرقہ پرست عناصر نے تین روزہ جلسہ کیا۔ اس میں ایک بہت بڑا بک اسٹال بھی رکھا گیا تھا۔ اس اسٹال پر دوسرے دل آزار لٹریچر کے ساتھ ستیارتھ پرکاش اور رنگیلا رسول جیسی کتابیں بھی رکھی گئیں۔ مسلمانوں نے ان کتابوں کو دیکھا تو ان کے اندر سخت غصہ اور اشتعال پیدا ہوا۔ انھوں نے فوراً ایک جوابی جلسہ کیا جس میں تقریباً ۵ ہزار مسلمان شریک ہوئے۔ مقررین نے پرجوش تقریریں کیں۔ پورا مجمع غصہ اور اشتعال سے بھر گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ یہاں سے اٹھ کر سیدھے ہندوؤں کے اجتماع میں جائیں گے اور وہاں شامیانہ کو توڑیں گے اور کتابوں کو جلا ڈالیں گے۔

عین اس وقت ایک سنجیدہ مقرر اسٹیج پر آیا اس نے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ یہ تقریر مسلمانوں کے مجمع پر ٹھنڈی بارش بن کر برسی۔ اور ہندو اجتماع کے لیے ایک ایسا شعلہ ثابت ہوئی جس نے براہ راست مداخلت کے بغیر ان کے سارے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔

مقرر نے کہا کہ اپنی بات کو میں علامہ اقبال کے ایک لطیفہ سے شروع کرتا ہوں۔ اس لطیفہ کو اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں اور اس سے واقعۃً سبق لے سکیں تو وہ آپ کے لیے اس قسم کے تمام فسادات اور شرارتوں کا تیر بہدف علاج ہے۔

لاہور میں علامہ اقبال کے محلہ میں زیادہ عمر کے ایک صاحب تھے جو اکثر علامہ اقبال سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے پوچھا کہ چڑھوتی کی حقیقت کیا ہے۔ کیسے ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی ایک لفظ (مثلاً کریلا) سے چڑھنے لگے۔ علامہ اقبال نے اس سوال کا کوئی براہ راست جواب نہیں دیا یہاں تک کہ وہ صاحب واپس چلے گیے۔

اگلے دن علامہ اقبال نے اپنے ملازم کو ان صاحب کے گھر یہ کہہ کر بھیجا کہ جاؤ ان سے آم کا اچار مانگ لاؤ۔ ملازم نے جاکر ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ نکلے تو اس نے کہا کہ علامہ اقبال نے آم کا اچار مانگا ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر ملازم کو رخصت کر دیا کہ میرے پاس آم کا اچار نہیں ہے۔ دو گھنٹہ کے بعد علامہ اقبال نے دوبارہ ملازم سے کہا کہ ان کے یہاں جاؤ اور آم کا اچار مانگ لاؤ۔ ملازم گیا اور دوبارہ ان کو علامہ اقبال کا پیغام پہونچایا۔ انھوں نے کسی قدر تیزی کے ساتھ کہا کہ میں نے تم کو بتا دیا کہ میرے پاس آم کا اچار نہیں ہے۔ علامہ اقبال ہر دو گھنٹہ کے بعد اس آدمی کو مذکورہ صاحب کے پاس آم کا اچار مانگنے کے لیے بھیجتے رہے اور ملازم ہر بار سخت تر لہجہ میں مذکورہ صاحب کا جواب لے کر واپس آتا رہا۔

یہاں تک کہ آخری بار جب ملازم ان کے یہاں گیا تو ان کی شدت غصہ میں تبدیل ہو گئی۔ انھوں نے آستین چڑھا کر ڈنڈا اٹھایا اور ملازم کو مارنے کے لیے دوڑے۔ اب ملازم آگے آگے بھاگ رہا ہے اور وہ صاحب ڈنڈا لیے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔

محلہ کے لڑکوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کو تجسس پیدا ہوا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ پوچھ گچھ کرنے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ یہ آم کے اچار کا قصہ تھا۔ اب "آم کا اچار" مذکورہ صاحب کی چڑھوتی بن گئی۔ اور محلہ کے لڑکوں کو بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ وہ صاحب جب بھی گھر سے باہر نکلتے، لڑکے ان کے پاس آکر کہتے "آم کا اچار"۔ یہ کہہ کر لڑکے بھاگتے اور وہ بزرگ لڑکوں کے پیچھے دوڑتے۔ آخر تنگ آکر انھوں نے یہ کیا کہ وہ ڈنڈا لے کر باہر نکلنے لگے۔ جب بھی وہ گھر سے نکلتے ان کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا

ضرور ہوتا۔ لڑکے آم کا اچار کہہ کر بھاگتے اور یہ ڈنڈا اٹھائے ہوئے ان کے پیچھے دوڑتے۔ اسی حالت میں ایک روز ایسا ہوا کہ تیز بھاگتے ہوئے وہ ایک گڑھے میں گر پڑے اور ان کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مہینوں کے علاج کے باوجود ان کی ہڈی درست نہ ہو سکی۔ جس ڈنڈے کو انھوں نے لڑکوں کو مارنے کے لیے بنایا تھا۔ وہ ان کی سہارے کی لاٹھی بن گئی جس کو ٹیک کر وہ چلتے تھے۔ وہ اسی حالت پر باقی رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

مقرر نے مسلمانوں کے مذکورہ جلسہ میں جب یہ لطیفہ سنایا تو مسلمانوں کا جوش اچانک ہنسی میں تبدیل ہو گیا۔ مقرر نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ فریق ثانی نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ کچھ چیزوں کو ہماری چڑھونی بنا لیا ہے۔ مثلاً خاص طرح کے نعرے لگانا، خاص طرح کے مضامین شائع کرنا، وغیرہ وہ لوگ ہم کو چڑھاتے ہیں اور ہم چڑھ جاتے ہیں۔ اگر ہم شعوری طور پر اس بات کو جان لیں کہ فریق ثانی جو کچھ کرتا ہے وہ دراصل چڑھونی کا معاملہ ہے اور چڑھونی کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اگر چڑھئے تو وہ چڑھونی ہے، اور اگر نہ چڑھئے تو اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ وہ ایسا پٹاخہ ہے جو پھسپھسا کر رہ گیا۔

میں مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ یہ طے کر لیں کہ فریق ثانی خواہ آپ کو کتنا ہی چڑھائے اور خواہ کیسی ہی چڑھونی آپ کے خلاف استعمال کرے، آپ کسی حال میں بھی نہیں چڑھیں گے۔ آپ ہمیشہ ایسی چیزوں سے اعراض کر کے گزر جائیں گے۔ اگر آپ ایسا کریں تو یقینی ہے کہ فسادات کی ساری عمارت دھڑام سے گر جائے گی۔

فسادات کے خلاف اس تیر بہدف نسخہ کا پہلا کامیاب تجربہ خود مذکورہ شہر میں ہوا۔ وہ مسلمان جو اپنے جلسہ گاہ سے اٹھ کر فریق ثانی کے جلسہ میں جاتے۔ وہاں ان کی کتابوں کو جلاتے اور پھر زیادہ بڑے پیمانہ پر خود جلائے جاتے، ان کا موڈ بالکل بدل گیا۔ ایک کہانی جو المیہ پر ختم ہوتی وہ اچانک طربیہ کی صورت میں بدل گئی۔

اس کے بعد مسلمان ٹھنڈے ہو کر سیدھے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مسلمانوں کا اس طرح لوٹنا فریق ثانی کے جلسہ پر بجلی بن کر گرا۔ مسلمانوں نے ان کی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں لی اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، وہ پہلے ہی اس کو خریدنے والے نہ تھے۔ ان کا وسیع پنڈال بھی آدمیوں سے خالی

رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین دن کا اجتماع دو ہی دن میں ختم ہو گیا۔ تمام کتابیں اور تمام دل آزار لٹریچر غیر فروخت شدہ حالت میں گاڑیوں میں لاد کر واپس گیا تاکہ دوبارہ ردی خانہ میں جاکر فروخت ہو۔

یہ فسادات کو ختم کرنے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ یہ یقینی طور پر ہر قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کا قاتل ہے۔ میری رائے ہے کہ مسلمان اس واقعہ کو آڈیو ٹیپ یا ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کرکے تیار رکھیں اور جہاں بھی فرقہ وارانہ فساد کا اندیشہ ہو فوراً وہاں پہونچ کر وہاں کے لوگوں کو سنائیں یا اس کی تصویریں دکھائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد فسادات کا سلسلہ اس طرح ختم ہو جائے گا جیسے جلتی آگ پر پانی ڈالا جائے اور وہ بجھ کر رہ جائے۔

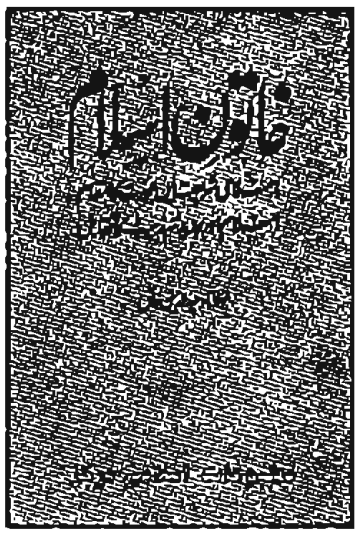

خاتونِ اسلام

اسلامی شریعت میں عورت کا مقام
اسلام اور جدید تہذیب کا تقابل

از: مولانا وحید الدین خاں

(صفحات ۲۹۲، قیمت ۳۵ روپیہ)

مکتبہ الرسالہ

سی-۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی-۱۳ فون: 697333, 611128

ذہنی فاصلہ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۱ میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر ہے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھے جو غالباً حضرت ابراہیم کے سو سال بعد پیدا ہوئے۔ ان کے مخاطب مدین کے لوگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اہل مدین قدیم زمانہ میں بحر احمر کے عرب ساحل پر آباد تھے۔ پیغمبر کا انکار کرنے کے بعد وہ ایک شدید زلزلہ میں تباہ کر دئے گئے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت شعیب نے جب اپنی قوم کو خدا کے دین کی دعوت دی تو انھوں نے کہا کہ اے شعیب، جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ (قالوا یا شعیب ما نفقہ کثیراً مما تقول (ہود ۹۱) حضرت شعیب علیہ السلام کو حدیث میں خطیب الانبیاء کہا گیا ہے (روح المعانی)، آپ واضح اور موثر انداز میں کلام کرنے کی خصوصی صلاحیت رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ آپ کے مخاطب (اہل مدین) حضرت ابراہیمؑ کو مانتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چوتھی پشت میں حضرت ابراہیم سے مل جاتا تھا۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ حضرت شعیب نے جب دین توحید کی بات ان کے سامنے پیش کی تو انھوں نے کہہ دیا کہ تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی نسل گزرنے کے بعد وہ حضرت ابراہیم کی اصل تعلیمات سے دور ہو چکے تھے۔ ان کی سوچ وہ نہ رہی تھی جو خدا کے پیغمبروں کی سوچ ہوتی ہے۔ اس طرح حضرت شعیب اور اہل مدین کے درمیان ایک قسم کا ذہنی فاصلہ (Intellectual gap) پیدا ہو چکا تھا۔ یہی چیز تھی جو ان کے لئے پیغمبر کی بات کو سمجھنے میں رکاوٹ بن گئی۔

جو لوگ غیر اللہ کی بڑائی میں جی رہے ہوں وہ اللہ کی بڑائی والی باتوں میں اپنی ذہنی غذا نہیں پاتے۔ جو لوگ دنیا کے فائدوں میں کھوئے ہوئے ہوں انھیں آخرت کے فائدہ کی بات بالکل اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ جو لوگ صرف اپنی عقل سے سوچنا جانتے ہوں وہ وحی کی رہنمائی کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جو لوگ قریب کی صرف چھوٹی مصلحتوں کو دیکھ پاتے ہوں، وہ ان عظیم تر مصلحتوں کو دیکھنے سے عاجز رہ جاتے ہیں جو مستقبل بعید کے پردہ میں چھپی ہوئی ہوں۔

اسی طرح جو لوگ نفرت کی نفسیات میں جیتے ہوں وہ محبت کے پیغام کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکتے۔ جو لوگ صرف لڑائی اور ٹکراؤ کی زبان جانتے ہوں ان کے لئے صبر اور اعراض کی حکمتوں تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ جو لوگ صرف انسانی عقل سے سوچنا اور رائے قائم کرنا جانتے ہوں وہ ان باتوں کو جاننے اور سمجھنے سے عاجز رہتے ہیں جن کا جاننا اور سمجھنا ربانی عقل کے بغیر ممکن نہیں۔

دینِ کامل

مولانا وحید الدین خاں

دینِ کامل

از مولانا وحید الدین خاں

قرآن میں اسلام کو دینِ کامل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دینِ مستحکم ہے۔ اسلام کا ظہور، دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ اسلام نے خدا کے دین کے ساتھ انسانی تعدی کے دور کو ختم کر دیا اور دین کو تمام پہلوؤں سے کامل کر کے اس کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ قیامت تک اس کی برتری باقی رہے وہ اپنے پیروؤں کے لیے ابدی سرفرازی کی ضمانت بن جائے۔

صفحات ۳۶۸ ہدیہ ۴۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

قال اللہ، قال الرسول

قرآن میں منکرین حق کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ——— اور انھوں نے شروع کیا تم سے پہلی بار (وَهُم بدءُوكم اوّل مرة، التوبہ ۱۳) مفسرین نے اس کی تشریح میں یہ قول نقل کیا ہے کہ البادیٔ اظلم (شروع کرنے والا زیادہ ظالم ہے)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن ابی هريرة، قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قلتَ لصاحبكَ يوم الجمعة انصِت والامام يخطبُ فقد لغوتَ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کے دن تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو، تو تم نے لغو کام کیا۔

قرآن کی مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو آدمی آپس میں لڑجائیں تو ان میں سے جس شخص نے ٹکراؤ میں پہل کیا ہے، وہ زیادہ بڑا ظالم قرار پائے گا۔ اجتماعی زندگی میں اختلاف یا شکایت کے مواقع آتے ہیں۔ مگر ایسے مواقع پر آدمی کو پرامن تدبیر پر رکے رہنا ہے۔ اس کے لیے کسی حال میں یہ جائز نہیں کہ وہ حد کو پار کرکے ٹکراؤ اور تصادم کے میدان میں داخل ہوجائے۔

اوپر جو حدیث نقل کی گئی، اس سے ایک اور اسلامی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک آدمی غلطی کر بیٹھے تو دوسرے آدمی کو چاہیے کہ وہ اس سے اعراض کرے، وہ ہرگز جوابی غلطی نہ کرے۔ جوابی غلطی، ایک غلطی کو دو غلطی بنا دیتی ہے۔ وہ اس برائی میں مزید اضافہ کر دیتی ہے جس کو برداشت نہ کرکے اس کے خلاف اقدام کیا گیا تھا۔

یہ خدا اور رسول کا حکم ہے۔ اس کے مطابق آدمی کو پہلی غلطی سے بھی بچنا ہے اور دوسری جوابی غلطی سے بھی۔ کیوں کہ پہلی غلطی کرنے والا اگر ظالم ہے تو دوسری غلطی کرنے والا لاغی۔

اس دنیا میں سب سے بڑا ظلم کرنے والا وہ ہے جو جارحیت کا آغاز کرے۔ اور سب سے زیادہ لغو کام کرنے والا وہ ہے جو ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرے۔ اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کو ظلم سے بھی بچنا ہے اور لغو کام کرنے سے بھی۔

اسلام اولاً فساد کی پہل کرنے والوں کو روکتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص پہلی نادانی کر بیٹھے تو اسلام کا تاکیدی حکم یہ ہے کہ فریق ثانی ہرگز دوسری نادانی نہ کرے۔

ہندستان میں ہولی کے دن ایک ہندو کچھ مسلمانوں کے اوپر رنگ ڈال دیتا ہے۔ مسلمان مشتعل ہوکر لڑنے لگتے ہیں۔ اور پھر ساری بستی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ پاکستان کے ایک ہوٹل میں کسی مسئلہ پر تکرار ہوتی ہے۔ ایک پٹھان کچھ مہاجرین کے اوپر گرم چائے کی پیالی پھینک دیتا ہے۔ یہ مہاجرین مشتعل ہوکر لڑ پڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد پورے شہر میں مہاجر مسلمان اور پٹھان مسلمان کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

ان واقعات میں بلاشبہ فساد کا آغاز کرنے والا ہندستان میں ہندو اور پاکستان میں پٹھان ہے۔ مگر قرآن کی رو سے دیکھئے تو دونوں جگہ فساد کو بڑھانے کی ذمہ داری فریق ثانی پر عائد ہوتی ہے۔ ہندستان میں مسلمان کے اوپر اور پاکستان میں مہاجر کے اوپر۔ کیوں کہ دونوں جگہ فریق ثانی نے یہ کیا کہ فریق اول کے جس واقعہ پر قرآن نے عفو و درگزر کا حکم دیا تھا۔ اس کو انھوں نے انتقام اور جوابی کارروائی کا عنوان بنایا۔

موجودہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ اس لیے مذکورہ نوعیت کے چھوٹے چھوٹے واقعات بہرحال ہر جگہ پیش آئیں گے، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ یہ اس تخلیقی منصوبہ کا فطری نتیجہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو بنایا ہے۔ اسی لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس طرح کے واقعات کو اعراض کے خانہ میں ڈال دو۔ اس کو اشتعال اور انتقام کا مسئلہ نہ بناؤ ——— اب جو شخص ایسا نہ کرے وہ بلاشبہہ غلطی پر ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے نظامِ تخلیق پر راضی نہیں ہوا۔

ہندستان اور پاکستان میں جو لوگ عفو و درگذر کے اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، وہی لوگ "پٹرو ڈالر" کے ملکوں میں جاکر مبالغہ کی حد تک عفو و درگذر کے اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں قرآن کے حکم کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت پٹرو ڈالر کے حکم کی ہے۔ اس سے زیادہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو قرآن کا مومن کامل سمجھتے ہیں۔

خدائی نشان

ٹائم میگزین ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ میں ایک باتصویر رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــــ آسمانوں سے جہنمی آگ :

Hellfire from the heavens

یہ ایک خوفناک ہوائی حادثہ کی رپورٹ ہے جو ۲۸ اگست ۱۹۸۸ کو مغربی جرمنی میں پیش آیا۔ فرینکفرٹ کے قریب رمسٹین ایر بیس (Ramstein Air Base) پر ایک ہوائی مظاہرہ (Air Show) ہو رہا تھا۔ جس میں جدید ترین قسم کے دس فوجی جہاز حصہ لے رہے تھے۔ اس نمائش کا نام دل کے درمیان تیر (Arrow through the heart) رکھا گیا تھا۔ تقریباً ۳ لاکھ (300,000) آدمی اس خصوصی مظاہرہ کو دیکھنے کے لیے جمع تھے۔

نقشہ ذیل کے مطابق، دس جہازوں نے فضا میں اڑکر دل کی تصویر بنائی۔ یہ سب جیٹ جہاز تھے جو ۳۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک جہاز کو پرواز کے دوران الگ ہوکر "دل" کے اندر سے تیر کی مانند پار ہونا تھا۔ جہاز کے ماہر پائلٹ نے حسب پروگرام جہاز کو اڑایا۔ مگر حساب کی معمولی

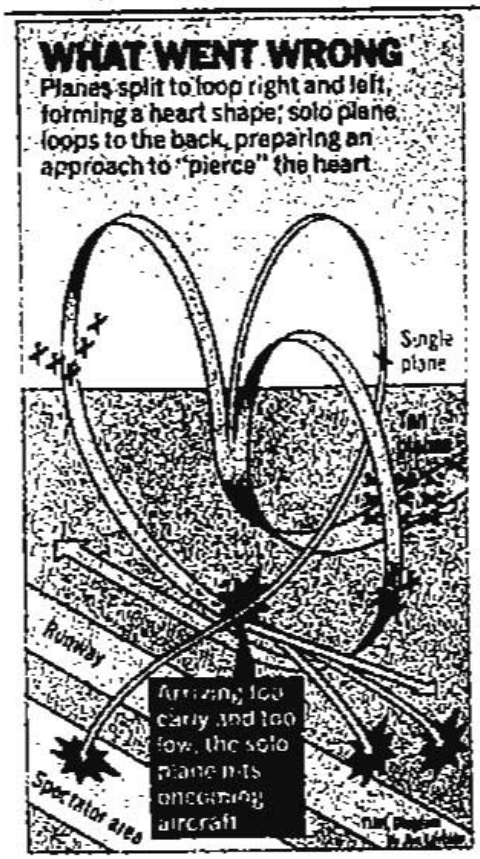

اس نقشہ کو دیکھیے۔ دس ہوائی جہاز ایک ساتھ اڑکر اوپر پہونچتے ہیں۔ پھر ان میں سے دس جہاز ایک طرف اور ۴ جہاز دوسری طرف جاکر اپنے پیچھے سے لال، سفید اور ہرے رنگ کا دھواں نکالتے ہوئے فضا میں دل کی شکل (یا پان کے پتہ کی شکل) بناتے ہیں۔ ان میں سے ایک جہاز بیچ سے الگ ہوکر پیچھے کی طرف جاتا ہے اور پھر واپس ہوکر "دل" کے اندر سے پار ہوکر باہر نکل جانا چاہتا ہے۔ نیچے "ستارہ" کے مقام پر وہ دوسرے جہاز سے ٹکرا جاتا ہے۔ کیوں کہ مقررہ حساب کے خلاف وہ کسی قدر جلد اور کسی قدر نیچے آگیا تھا۔

غلطی سے یہ جہاز (تیر) دوسرے جہازوں کے مقام اتصال پر چند سکنڈ پہلے پہونچ گیا۔ نیز یہ کہ اس جہاز (تیر) کو دوسرے جہازوں کی سطح پرواز سے کسی قدر بلندی پر اڑنا تھا۔ مگر اس کی سطح پرواز مقام اتصال پر عین وہی ہوگئی جو مقابل کے دوسرے جہاز کی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "تیر" فضا سے پار ہونے کے بجائے مقابل کے جہاز سے ٹکرا گیا۔ تین جہازوں میں فوراً آگ لگ گئی۔ عام حالات میں فوجی جہازوں کی یہ غیر معمولی نمائش لوگوں کے اندر زبردست جوش و مسرت پیدا کرنے کا سبب بنتی۔ مگر مذکورہ حادثہ کے بعد وہ جہنمی لمحات (Hellish mintues) میں تبدیل ہوگئی۔

یہ جہاز رانی کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ بھیانک ہوائی حادثہ تھا۔ تین جہازوں کے پائلٹ اپنے جہازوں کے ساتھ فوراً ہلاک ہوگیے۔ نمائش دیکھنے والوں میں تقریباً ۷۰ آدمی جل کر مر گیے۔ زخمیوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ یہ حادثہ اتنا اچانک تھا کہ لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ بھی کوئی تماشہ ہے۔ ایک شخص نے کہا:

I thought it was just some kind of special effect.

اس ہوائی مظاہرے کی تصویریں ٹیلی ویژن پر لی جارہی تھیں۔ چنانچہ شروع سے آخر تک تمام مناظر رنگین تصویروں کی صورت میں ریکارڈ ہوگیے۔ ٹائم کی مطبوعہ تصویروں میں دکھایا گیا ہے کہ جہازوں کے ٹکراتے ہی زبردست آگ لگ گئی۔ جہازوں کے جلتے ہوئے ٹکڑے کھڑی ہوئی کاروں پر گرتے ہیں اور کاریں جلنے لگتی ہیں۔ تماشائیوں کے مجمع کے اوپر آگ سرخ بادل کی طرح امنڈ پڑتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آسمان سے جہنمی آگ کا بہت بڑا گولہ گر پڑا ہو۔

خوشیاں اچانک غم میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں ادھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ۔ میں چیخ پڑا کہ ہائے خدا۔ میں نے اوپر دیکھا تو وہاں آگ کے سوا اور کچھ نہ تھا:

"I yelled, 'Oh, God,' and looked over my shoulder and saw nothing but fire."

یہ ہوائی مظاہرہ انتہائی تربیت یافتہ فوجی پائلٹ انجام دے رہے تھے۔ منتظمین کو ان کی

مہارت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہاں کوئی ایمبولنس کار تک موجود نہ تھی۔ وہ اس قسم کے حادثہ کی بالکل امید نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ زخمیوں کو فوری طور پر اسپتال پہنچانے میں سخت مشکل پیش آئی۔

اس انسانی واقعہ میں بہت بڑا خدائی سبق ہے۔ وہ یہ کہ "دل کے درمیان سے تیر" گزارنے کا جو عمل جرمنی کے ہوابازوں نے بہت چھوٹے پیمانہ پر کرنا چاہا اور وہ اس میں ناکام رہے۔ یہی عمل بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر وسیع کائنات میں ہر آن ہو رہا ہے، مگر یہاں کسی قسم کا حادثہ پیش نہیں آتا۔

آسمان میں ستاروں کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی تمام سمندروں کے کنارے ریت کے ذروں کی تعداد ہے۔ یہ تمام ستارے ہر لمحہ نہایت تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ مگر ان میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ ایک کہکشاں جس کے اندر اربوں کی تعداد میں بڑے بڑے ستارے ہوتے ہیں، وہ حرکت کرتی ہوئی دوسری کہکشاں کے اندر داخل ہوتی ہے اور پھر اس کے پار ہو جاتی ہے، مگر دونوں کہکشاؤں کے ستارے آپس میں نہیں ٹکراتے۔

یہ واقعہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کوئی بہت بڑا انتظام کرنے والا ہے جو اس کائنات کا انتظام کر رہا ہے۔ ایک اتھاہ قوتوں والا انتظام کار اگر اس دنیا کے پیچھے نہ ہو تو سارا کائناتی کارخانہ اسی طرح تباہ و برباد ہو کر رہ جائے جس طرح جرمنی کی ہوائی نمائش تباہ ہو کر رہ گئی۔

میوات کا سفر

صفحات ۲۲۰ ھدیہ ۲۵ روپیہ

بے خبری

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "آزادیٔ ہند" (India Wins Freedom) کے ۳۰ صفحات مصنف کی وصیت کے مطابق مہر بند کر دیئے گئے تھے۔ اب تیس سال پورے ہونے کے بعد وہ چھاپے گئے ہیں۔ ان صفحات میں بتایا گیا ہے کہ جواہر لال نہرو (سابق صدر کانگرس) کی دو غلطیاں بڑی حد تک تقسیم ہند کا سبب بنیں۔

جواہر لال نہرو سے پہلی غلطی ۱۹۳۷ کے الکشن کے بعد ہوئی۔ یہ الکشن انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت ہوا تھا۔ اس الکشن میں مسلم لیگ کو پورے ملک میں سخت دھکا لگا تھا۔ صرف دو صوبوں (بمبئی اور یوپی) میں وہ کچھ کامیابی حاصل کر سکی تھی۔ الکشن کے نتائج سے مسلم لیگ کی علٰحدگی پسندی کے رجحان پر زد پڑی۔ اس نے کانگرس کے ساتھ وزارت میں شامل ہونے کی پیش کش کی۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ اس کے دو لیڈر، چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو ریاستی کیبنٹ میں لے لیا جائے۔ مگر نہرو نے دونوں میں صرف ایک کو لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ نہرو کی یہ تجویز مسلم لیگ کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔ چنانچہ وہ کانگریس کے قریب آکر دوبارہ اس سے دور ہو گئی۔

جواہر لال نہرو کی دوسری سیاسی غلطی وہ ہے جو انھوں نے ۱۹۴۶ میں کی۔ اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے کیبنٹ مشن پلان کے تحت متحدہ ہندستان کی تجویز کو منظور کر لیا تھا۔ اس طرح مسلم لیگ دوبارہ تقسیم کے نظریہ سے ہٹ کر متحدہ ہندستان کے نظریہ کے قریب آگئی تھی۔ مگر نہرو نے صدر کانگریس کی حیثیت سے جولائی ۱۹۴۶ میں ایک پریس کانفرنس کی۔ اس میں انھوں نے اعلان کر دیا کہ کانگریس آئندہ کیبنٹ مشن پلان کو تبدیل (Modify) کر سکتی ہے۔ مسٹر جناح اس بات پر سخت ناراض ہوئے۔ وہ کانگریس سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گیے جس کا آخری نتیجہ ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) کی صورت میں برآمد ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ کیبنٹ مشن پلان آزاد ہندستان کے constitution کی بنیاد تھا۔ اس کو منقسم ہندستان کے بجائے متحد ہندستان کے تصور پر بنایا گیا تھا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ مسٹر جناح نے اس کے بعد کہا کہ اگر کانگریس کیبنٹ مشن کی پابند نہ ہو اور اس کے نقشہ کو دستور ساز

اسمبلی میں اپنی اکثریت کے زور پر بدل دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقلیتیں صرف اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گی :

Jinnah argued that if the Congress did not stick to the plan as accepted and changed the scheme through its majority in the constituent assembly, that would mean minorities would be placed at the mercy of the majority.
(*Indian Express*, October 30, 1988)

مولانا آزاد کے "تیس صفحات" میں جب میں نے یہ بات پڑھی تو مجھے قرآن کی ایک آیت یاد آگئی۔ اس آیت کے الفاظ یہ ہیں : كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (کتنے چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب آتے ہیں، اللہ کے اذن سے)

میں نے سوچا کہ کیسے عجیب تھے وہ مسلم لیڈر جن کو نہرو کا بیان معلوم تھا مگر انھیں خدا کا بیان معلوم نہ تھا۔ انھیں اقلیت اور اکثریت کی یہ منطق معلوم تھی کہ دستور ساز اسمبلی میں تعداد کی کمی انھیں اکثریتی فرقے کے ماتحت بنا دے گی۔ مگر وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اس سیاسی منطق کے اوپر بھی ایک منطق ہے اور وہ یہ طاقت رکھتی ہے کہ خود اکثریت کے اوپر اقلیت کو بالا کر دے۔

اعلان

عمومی دعوت کے لیے انگریزی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ فروری ۱۹۸۴ میں انگریزی الرسالہ جاری کیا گیا تھا۔ پانچ سال سے غیر معمولی خسارہ کے ساتھ اس کو نکالا جاتا رہا ہے۔ مگر قوم کے اندر دعوتی جذبہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کام میں ہمیں کوئی قابل ذکر تعاون نہ مل سکا۔ اب شدید مالی دشواریوں کے باعث انگریزی الرسالہ کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ آئندہ اگر حالات سازگار ہوئے تو انشاء اللہ اس کو دوبارہ جاری کیا جائے گا۔

صدر اسلامی مرکز

ایک سفر

نئی دہلی کے افغانی سفارت خانہ سے مجھے ان کا خط مورخہ ۴ اکتوبر ۱۹۸۸ ملا جس میں فرسٹ سکرٹری کے دستخط تھے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ افغانستان کی اسلامی وزارت اور وہاں کی مجلس علماء کے اشتراک سے ایک انٹرنیشنل سیرت کانفرنس منعقد کی جارہی ہے۔ یہ کانفرنس ۲۲-۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو کابل میں ہوگی۔ مجھے دعوت دی گئی تھی کہ میں اس کانفرنس میں شرکت کروں اور وہاں سیرت کے یونیورسل پہلو پر ایک مقالہ پیش کروں۔ اس دعوت کے مطابق کابل (افغانستان) کا سفر ہوا۔

۲۰ اکتوبر کو صبح پونے پانچ بجے کا وقت تھا۔ فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اچانک باہر سے ہارن کی آواز آئی۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ کل شام کو "ٹیکسی اسٹینڈ" سے ٹیلیفون پر کہا گیا تھا کہ ہم کو صبح پونے پانچ بجے ایک ٹیکسی کی ضرورت ہے۔ اس کے مطابق ٹیکسی والا ٹھیک چار بجکر ۴۵ منٹ پر ہمارے گیٹ کے سامنے موجود تھا، نہ ایک منٹ پہلے اور نہ ایک منٹ بعد۔

ٹیکسی والا اپنے پیشہ کے معاملہ میں اتنا زیادہ پابند کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے پیشہ کو اپنے ذاتی انٹرسٹ کی چیز بنا رکھا ہے۔ کوئی معاملہ جب آدمی کے لئے ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ بن جائے تو اس کے بارہ میں وہ ہر بات کو بتائے بغیر جان لیتا ہے۔ اس کے لئے اس کی تمام ذہنی اور عملی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ مسلمانوں نے اسلامی دعوت کے معاملہ کو اپنے ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اسلامی دعوت کے معاملہ میں وہ کردار نظر نہیں آتا جس کا ایک نمونہ ٹیکسی والے کے یہاں ملتا ہے۔

گھر سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا تو سڑک کے دونوں طرف سرسبز درختوں کی قطاریں مسلسل چلی جارہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر مجھے ۱۹۸۳ کا سفر یاد آیا جب کہ الشیخ علی الحویتی (قاضی شارجہ) مجھے اپنے رہائشی مکان پر لے گئے تھے جو کہ شہر سے تقریباً ۲۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ سفر پورا کا پورا ریتیلے میدان میں ہوا۔ دہلی کا سفر اگر سرسبز ماحول میں تھا تو شارجہ کا یہ سفر صحرائی ماحول میں۔ اس دنیا میں "درخت" اس لئے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر شکر کرے۔ "صحرا" اس لئے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر صبر کرنا سیکھے۔ آدمی دونوں قسم کی چیزوں کو دیکھتا ہے مگر وہ ان سے نہ شکر کا سبق لیتا ہے اور نہ صبر کا۔

دہلی میں دو ایرپورٹ ہیں اور دونوں کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ ٹیکسی والے نے ہم کو قریب کے

ہوائی اڈہ (پالم ایر پورٹ) پر پہنچا دیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ کابل کا جہاز اگلے ہوائی اڈہ (اندرا ایر پورٹ) سے جائے گا۔ چنانچہ پالم سے واپس ہو کر دوبارہ آگے کے لئے روانہ ہوئے۔ چوں کہ ہم گھر سے کسی قدر پہلے روانہ ہو گئے تھے اس لئے اس تاخیر سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اسی قسم کے اتفاقات ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے روانہ ہو تاکہ اگر راستہ میں تاخیر کا کوئی اتفاقی سبب پیش آجائے تب بھی وقت پر اپنی منزل پر پہنچ جاؤ۔

اس تجربہ کے بعد مجھے حضرت ابو ہریرہ کی وہ حدیث یاد آئی جس کو ترمذی نے روایت کیا ہے:

قال رسول صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ خَافَ أَدْلَجَ وَمَنْ أَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللهِ غَالِيَةٌ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللهِ الْجَنَّةُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی کو اندیشہ ہوتا ہے وہ رات سے اپنا سفر شروع کرتا ہے، اور جو رات سے اپنا سفر شروع کرتا ہے وہی (دن میں) اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔ سن لو کہ اللہ کا سودا بہت قیمتی ہے، سن لو کہ اللہ کا سودا جنت ہے۔

دنیا کے مقصد کو پانا ہو یا آخرت کے مقصد کو پانا، دونوں ہی میں خصوصی اہتمام کرنا ضروری ہے۔ خصوصی اہتمام کے بغیر نہ دنیا کا مقصد صحیح طور پر حاصل کیا جا سکتا اور نہ آخرت کا۔

جہاز کو مقررہ وقت کے اعتبار سے ساڑھے سات بجے روانہ ہونا تھا۔ تمام مسافر جہاز میں بیٹھے ہوئے اڑان کا انتظار کر رہے تھے کہ آدھ گھنٹہ بعد پائلٹ نے ہوائی جہاز کے ایڈریس سسٹم پر اعلان کیا کہ جہاز کے ایک پہیہ میں پریشر کم پایا گیا ہے۔ اس لئے اس کو بدلا جا رہا ہے۔ آپ اس دیری کے لئے ہمیں معاف کریں گے۔ دیری بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ جہاز روانہ ہوا تو گھڑی میں ساڑھے دس بج رہے تھے۔ یعنی اصل مقررہ وقت سے دو گھنٹہ بعد ——— دہلی سے کابل تک جہاز کو پہنچنے کے لئے ڈھائی گھنٹہ درکار تھا۔ مگر دہلی میں پہیہ کی اصلاح میں دو گھنٹے لگ گئے۔

جہاز کے ساتھ یہ جو حادثہ پیش آیا، اس کا "جھٹکا" جہاز سے زیادہ جہاز کے مسافروں کو برداشت کرنا پڑا۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ چلتی ہوئی سواری پر مسافر کی حیثیت شاک ابزاربر (جھٹکا سہنے والے) کی ہوتی ہے:

Passengers are shock absorbers on moving vehicles.

ایر پورٹ کے اندر داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا گویا ہم ایک اور ملک میں پہنچ گئے ہیں۔ یہاں

ہر چیز کا معیار مختلف تھا۔ ایرپورٹ کے باہر اگر "دیشی ہندستان" کا منظر تھا تو ایرپورٹ کے اندر "بدیشی ہندستان" کا۔ ہر ملک خواہ وہ کتنا ہی غریب ہو، یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے ایرپورٹ کو بین اقوامی معیار پر بنائے۔ "ایرپورٹ" گویا ہر ملک کا ایک تہذیبی جزیرہ ہے۔

ایک سیاح تھوڑے دنوں کے لئے ہندستان آیا۔ اس نے ان مقامات کا سفر کیا جہاں ہوائی جہاز اس کو لے جا سکتا تھا۔ اس نے لال قلعہ اور تاج محل جیسی قابل دید چیزوں کا مشاہدہ کیا اور پھر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ اس سیاح کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے ہندستان کے تہذیبی جزیرہ کو دیکھا، وہ وسیع تر ہندستان کو نہ دیکھ سکا۔ ایسی حالت میں عجب نہیں کہ وہ واپس جا کر لکھے: ہندستان کے لوگ بہت خوش قسمت ہیں۔ وہ ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ جب وہ زندہ ہوتے ہیں تو وہ لال قلعہ میں رہتے ہیں، اور جب مرتے ہیں تو تاج محل میں دفن ہوتے ہیں ——— مصنوعی مشاہدہ اور حقیقی مشاہدہ میں کتنا زیادہ فرق ہے۔

ہوائی جہاز جب بلند ہو کر فضا میں اڑتا ہے، اس وقت آپ نیچے زمین کی طرف دیکھیں تو زمین کی سطح پر ہر چیز معمولی دکھائی دیتی ہے ——— مکانات چھوٹے چھوٹے گھروندوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ سڑکیں پھیلی ہوئی لکیر کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔ سمندروں میں تیرتے ہوئے جہاز دیا سلائی کی ڈبیا معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے کہ وہ صرف ٹیلے ہوں۔ اونچے کھڑے ہوئے درخت پودے کی مانند نظر آتے ہیں۔ وغیرہ۔

میں نے اس منظر کو دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز "عالم سفلی" سے اوپر اٹھ کر "عالم علوی" میں سفر کر رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ مادی مشاہدہ ایک روحانی حقیقت کی تمثیل ہے۔ مومن کو دنیا میں اس طرح رہنا ہے کہ اس کا جسم بظاہر عالم سفلی میں ہو، مگر اس کی روح یا اس کا فکری وجود عالم علوی میں سفر کر رہا ہو۔ موجودہ دنیا میں اس طرح اپنے آپ کو بلند کرنا درحقیقت حیات دنیا سے گزر کر حیات آخرت کا تجربہ کرنا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ تجربہ جسمانی طور پر ہوتا ہے۔ موت کے بعد کی زندگی میں یہ تجربہ واقعی طور پر ہوگا۔

جہاز میں آج کے اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات مطالعہ کے لئے موجود تھے۔ اخبار اٹھایا تو ہر ایک کی پہلی سرخی ایک سخت ہوائی حادثہ کے بارہ میں تھی۔ نوبھارت ٹائمز (۲۰ اکتوبر) کی پہلی سرخی یہ تھی:

"دو وِمان درگھٹناؤں میں ۱۶۴ مرے"۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۰ اکتوبر) کی پہلی آٹھ کالمی سرخی یہ تھی :

164 killed as IA, Vayudoot planes crash

یہ ہندستان کی شہری ہوا بازی کی تاریخ میں دوسرا سب سے زیادہ ہولناک حادثہ تھا۔ پہلا شدید تر حادثہ وہ تھا جو ۲۳ جون ۱۹۸۵ کو پیش آیا۔ ایر انڈیا کا ایک جہاز (کنشکا) ایک بم کے پھٹنے سے تباہ ہوگیا تھا اور بحر الکاہل میں گر پڑا تھا۔ موجودہ حادثہ دو الگ الگ جہازوں کا تھا مگر وہ ایک ہی دن ہوا۔ ایک احمد آباد میں اور دوسرا گوہاٹی میں۔ دونوں موسم کی خرابی کی بنا پر ہوئے۔ احمد آباد میں تباہ ہونے والا جہاز جب ہوائی اڈہ کے اوپر پہنچا تو وہاں فضا میں سخت کہر کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پائلٹ سطح زمین پر دیکھ نہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ (۲۰ اکتوبر) کے مطابق جہاز ہوائی اڈہ کے اندر اترنے والی سڑک پر اترنے کے بجائے باہر ایک کھیت میں اتر گیا اور وہاں درختوں سے ٹکرا کر تباہ ہوگیا :

Instead of landing at the airstrip, it crashed into a field in the outskirts of the city.

اسی طرح چند دن پہلے اخبار کے صفحہ اول پر ایک تصویر تھی جس میں ایک ٹوٹا ہوا جہاز آگ کے شعلوں کی نذر ہو رہا تھا۔ یہ یوگنڈا کی کمپنی (Ugandan Airlines) کی فلائٹ نمبر ۷۷۵ تھی۔ یہ بوئنگ جہاز لندن سے براستہ روم یوگنڈا جا رہا تھا۔ اس پر عملہ سمیت ۵۲ مسافر سوار تھے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۸ کی شام کو اسے کچھ دیر کے لئے روم کے ہوائی اڈہ پر اترنا تھا۔ اس وقت یہاں شدید کہر چھایا ہوا تھا۔ جہاز کا پائلٹ رن وے کو صاف طور پر دیکھ نہ سکا۔ چنانچہ جہاز ایک پختہ عمارت (Hangar) سے ٹکرا گیا۔ ٹکراتے ہی جہاز آگ کا ایک گولا بن گیا۔ بیشتر لوگ اسی وقت ہلاک ہوگئے۔ تقریباً ۲۰ آدمی اس حالت میں اسپتال میں پہنچائے گئے کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اور بدن آگ کے اثر سے جھلسا ہوا تھا۔

زندگی حادثات سے اتنی زیادہ بھری ہوئی ہے کہ آدمی اگر حادثات کو یاد رکھے تو اس کے اعصاب پھٹ جائیں اور پھر وہ کوئی سفر یا دوسرا کوئی اقدامی کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب نعمت ذہن کی وہ صفت ہے جس کو قدیم زمانہ میں فراموشی کہا جاتا تھا، اور موجودہ زمانہ

ہیں اس کو لاشعور کا معاملہ کہا جاتا ہے۔

جدید نفسیاتی تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسان جب رات کو سوتا ہے تو اس کا ذہن خود کار مشین کی طرح ایک خاموش کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وہ یاد رکھنے کے قابل باتوں کو تو زندہ شعور کے خانہ میں باقی رکھتا ہے۔ اور دوسری تمام باتوں کو دماغ کے پچھلے خانہ (لاشعور) میں ڈال دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کے ساتھ دن میں ایک سخت واقعہ پیش آتا ہے، شام کو وہ اس حال میں سوتا ہے کہ وہ اعصابی تناؤ میں مبتلا ہوتا ہے۔ مگر صبح کو جب وہ اٹھتا ہے تو دوبارہ وہ تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی ذہن عام مشینی کمپیوٹر کی مانند ہوتا اور تمام پیش آنے والی باتوں کو یکساں طور پر اپنی یادوں میں لئے رہتا تو انسان کے لئے زندگی گزارنا ہی ناممکن ہو جاتا۔

اخبار میں ایک عبرت انگیز خبر پڑھی جو نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اس کے مطابق ۷ اگست ۱۹۸۸ کا ہوائی حادثہ جس میں جنرل ضیاء الحق، امریکی سفیر اور دوسرے بہت سے "وی آئی پی" ہلاک ہوئے، اس کے سبب کے بارہ میں امریکہ اور پاکستان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پاکستان مصر ہے کہ یہ تخریب کاری (Sabotage) کا نتیجہ تھا۔ جب کہ امریکی ماہرین جنھوں نے حادثہ کے تمام پہلوؤں کا نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ حادثہ کا سبب جہاز میں مشینی خرابی (Mechanical failure) تھا۔ امریکہ نے واقعہ کو صرف ٹکنکل حقیقت کے اعتبار سے دیکھا۔ اس کو واقعہ کا صرف وہی سبب دکھائی دیا جو فی الواقع تھا۔ جب کہ پاکستان کو اس حادثہ سے سیاسی اور قومی فائدہ اٹھانا تھا۔ اس لئے اس نے ماہرین کی رپورٹ کی اشاعت کو "عوامی مفاد" کے خلاف قرار دے کر اعلان کر دیا کہ اس کا سبب تخریب کاری تھا۔

امریکی حکام نے تاریخ نگاری کے اصول کو اختیار کیا، پاکستانی حکام نے تاریخ سازی کے طریقہ کو، اور دنیا میں سب سے زیادہ جو چیز پائی جاتی ہے وہ یہی تاریخ سازی ہے۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ کے مسلمان لکھنے والے تو شاید تاریخ سازی کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔

ملاپ (۲۰ اکتوبر ۱۹۸۸) میں دسہرہ کی مناسبت سے اداریہ تھا: مَن کا راون کب جلے گا۔ اس میں اڈیٹر نے لکھا تھا کہ "آج دسہرہ کے دن سارا دیش خوشیاں منا رہا ہے۔ کیوں کہ آج کے دن بھگوان رام نے راون روپی برائیوں کو ختم کر کے فتح حاصل کی تھی۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ صرف پتلا ہی جلایا جاتا ہے

اور باقی برائی جوں کی توں قائم رہتی ہے۔

ایک مسلمان اگر میلاد النبی کے جلسوں پر تبصرہ کرے تو وہ بھی اسی قسم کے الفاظ لکھے گا کہ میلاد النبی کے جشن میں رسول اللہ کے بارہ میں پرجوش تقریریں ہوتی ہیں مگر رسول اللہ کی سنت پر عمل نہیں کیا جاتا۔

میرے نزدیک یہ دونوں تبصرے بالکل بے فائدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے دسہرہ کی کوئی اصل نہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دینی اعتبار سے میلاد النبی کے جشن اور جلوسوں کی کوئی اصل نہیں۔ اس لئے دونوں مبصروں کو سرے سے ان رسموں ہی کو لغو قرار دینا چاہئے۔ ہندو مصلح کو یہ کہنا چاہئے کہ دسہرہ کا میلا ایک تاریخی بدعت ہے، اس لئے اس کو ختم کرو۔ اسی طرح مسلمان مصلح کو یہ کہنا چاہئے کہ "جشن میلاد النبی" ایک دینی بدعت ہے، اس لئے اس کو بند کرو۔ مگر ایسا کہنے کی ہمت نہ ہندو مصلح میں ہے اور نہ مسلمان مصلح میں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسی زبان بولتے ہی وہ اپنی قوم میں نکو بن جائیں گے۔ مگر اصلاح کا کام ہمیشہ نکو بننے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو نکو بننے کا حوصلہ نہ ہو انھیں مصلح کا کریڈٹ لینے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہئے۔

جہاز میں ایک عرب مسافر سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ ایک عربی اخبار الوطن (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸) تھا۔ یہ کویت سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے صفحہ اول پر ایک چھوٹا سا مضمون چوکھٹے میں تھا۔ یہ سوال کے انداز میں تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے: هل تعرفون ما العلاقة بين صمت الانظمة العربية على تقسيم لبنان والمثل العربي القائل بأن "الصمت علامة الرضا"۔ یعنی کیا آپ جانتے ہیں کہ لبنان کی تقسیم پر عرب حکومتوں کی خاموشی اور اس عربی مثل میں کیا نسبت ہے کہ خاموشی رضامندی کی علامت ہے۔

الوطن العربی کی ایک اور خبر میں بتایا گیا تھا کہ عرب دنیا کی آبادی، تازہ اعداد و شمار کے مطابق، ۱۵۶ ملین ہے (۱۵۶ مليونا عدد سكان العالم العربي)۔ یہاں بھی میرا خیال ہے کہ مذکورہ سوال ۱۵۶ ملین عربوں سے کرنے کے بجائے لبنان کے ان مسلمانوں سے کرنا چاہئے جنھوں نے انتہائی نادان سیاست اختیار کرکے وہ صورت حال پیدا کی جو بالآخر تقسیم تک جا پہنچی۔ یہ تقسیم اگر مکمل ہو گئی تو تقسیم کے بعد اس کا جو حصہ مسلمانوں کو ملے گا وہ گویا عرب دنیا کا "بنگلہ دیش" ہوگا۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۸ کی صبح کو جب انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۴۵۱ مجھے لئے ہوئے کابل کی طرف جا رہی

تھی تو مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بیرونی سفر کے دوران میری ملاقات پاکستان کے ایک افسر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا نے پاکستان (کراچی، لاہور) کے لئے جو ہوائی سروس جاری کی ہے، وہ ایر انڈیا (بین اقوامی ہوائی ادارہ) کے تحت نہیں ہے، بلکہ انڈین ایر لائنز (ملکی ہوائی ادارہ) کے تحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا نے ابھی تک ہم کو ایک مستقل ملک کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا، وہ ہم کو اپنی وسیع تر سلطنت کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔

دوسری طرف انڈیا کا حال یہ ہے کہ میں ۱۵ اگست ۱۹۸۸ کو نئی دہلی کے ایک اجتماع میں شریک ہوا۔ اس میں پاکستان کے قائم مقام سفیر کو چیف گسٹ کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان ناجنگ معاہدہ (No-war pact) کی انتہائی شدید ضرورت ہے تاکہ دونوں ملک ایک دوسرے کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنے ترقیاتی کاموں میں لگ سکیں۔ مگر، ان کے بیان کے مطابق، دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان ناجنگ معاہدہ پر صرف اس لئے اب تک دستخط نہ ہو سکے کہ انڈیا کا اصرار تھا کہ مسودہ میں ایک دفعہ یہ بڑھائی جائے کہ پاکستان کسی بیرونی ملک کو اپنی زمین پر فوجی بیس بنانے کی اجازت نہیں دے گا۔

میرے نزدیک پاکستان اور ہندستان دونوں ملک ایک دوسرے کے خلاف شبہات کا شکار ہیں۔ مگر انڈیا کے بارہ میں پاکستان کا شبہہ بھی غلط ہے اور پاکستان کے بارہ میں انڈیا کا شبہہ بھی غلط۔ یہ شبہات ایسے ہی بے بنیاد ہیں جیسے کہا جائے کہ انڈیا افغانستان کو اپنے ملک کا ایک صوبہ سمجھتا ہے، حتی کہ بنکاک پورٹ بلیر، سنگاپور، مالدیپ وغیرہ کو بھی، کیوں کہ اس نے ان تمام جگہوں پر ایر انڈیا کے بجائے انڈین ایر لائنز کے تحت اپنی ہوائی سروس جاری کر رکھی ہے۔

ایک معاملہ کو شبہہ کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھیانک بن جاتا ہے۔ اسی معاملہ کو شبہات سے اوپر اٹھ کر دیکھیں تو وہ معمولی قسم کا ایک سادہ واقعہ معلوم ہوگا۔

"تھوڑی دیر بعد ہمارا جہاز کابل کے ہوائی اڈہ پر اترے گا"۔ اناؤنسر نے اعلان کیا۔ چند منٹ میں جہاز بالکل نیچے آگیا اور ہوائی اڈہ کی زمین صاف دکھائی دینے لگی۔ اتنے میں اچانک ہوائی جہاز اوپر اٹھنے لگا۔ اس نے فضا میں بلند ہو کر چند چکر لگائے اور پھر کسی قدر تاخیر کے ساتھ ہوائی اڈہ پر اترا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ کچھ فوٹو گرافر ہوائی جہاز کا فوٹو لینے کے لئے رن وے پر آگئے تھے۔ اترنے کی صورت میں چوں کہ ان سے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا، اس لئے پائلٹ نے جہاز کا رخ دوبارہ اوپر کی طرف کر دیا۔ اور ہوائی اڈہ کا چند

چکر لگا کر دوبارہ نیچے آیا۔

جہاز میں بیک وقت دونوں صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ اوپر جا کر دوبارہ نیچے آسکتا ہے، اسی طرح وہ نیچے آکر دوبارہ اوپر کی طرف اٹھ سکتا ہے۔ یہی دوگونہ صفتیں زندگی کے وسیع تر سفر کے لئے بھی درکار ہیں۔ جو لوگ صرف ایک رخ پر بڑھنا جانتے ہوں۔ وہ اوپر جا کر نیچے نہ اتریں، یا نیچے آکر دوبارہ اوپر نہ جاسکیں، ایسے لوگ کبھی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔

ہوائی اڈہ پر اترے تو نظر آیا کہ اوپر ہر طرف فوجی ہیلی کاپٹر اڑ رہے ہیں۔ یہ اہتمام سیکوریٹی کی غرض سے کیا گیا تھا۔ میں نے فضا میں دیکھا تو اڑتے ہوئے ہیلی کاپٹر بار بار کوئی چیز گرا رہے تھے جو باہر آتے ہی آگ کے گولے کی طرح جل اٹھتی تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ سفید دھوئیں کی لکیر کی طرح فضا میں پھیل جاتی تھی۔ یہ واقعہ فضا میں بار بار ہو رہا تھا۔

ایک افغانی سے میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ "پہاڑوں" کی طرف سے لوگ امریکہ کے بنے ہوئے اینٹی ایرکرافٹ مزائل مارتے ہیں جن کو اسٹنگر (Stinger) کہا جاتا ہے۔ ان اسٹنگروں میں یہ صفت ہے کہ وہ گرم چیز کی طرف تیزی سے جاتے ہیں جس رخ پر انھیں پھینکا گیا ہے، وہاں سب سے زیادہ گرم چیز ہوائی جہاز کا انجن ہے۔ چنانچہ وہ انجن کا پیچھا کر کے اس کو مارتے ہیں۔

شروع میں اسٹنگر ہوائی جہازوں کو مار گرانے کا بالکل یقینی ذریعہ تھے۔ مگر اس کے بعد روسیوں نے ایک چیز ایجاد کر کے اسٹنگر کو بڑی حد تک بے اثر بنا دیا ہے۔ اس ایجاد کا نام فش (Fish) ہے۔ فش کوئی کیمیکل ہے۔ جب اس کو ہیلی کاپٹر کے باہر پھینکا جاتا ہے تو وہ بھڑک کر جل اٹھتا ہے۔ یہ جلنے والا مادہ جہاز کے انجن سے زیادہ گرم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اسٹنگر کو اس کی طرف پھینکا جاتا ہے تو وہ جہاز کے انجن کی طرف جلنے کے بجائے جلتے ہوئے گرم مادہ کی طرف جا کر اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس طرح ہوائی جہاز بچ کر آگے نکل جاتا ہے۔

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں ہر شخص دوسرے شخص کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ زیرک انسان آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ نشانہ کو بے نشانہ کر دے۔ وہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو نشانہ بننے سے بچا لے۔ فریق ثانی کے خلاف شور وغل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

آج کل ایک جغرافی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کو جنوبی ایشیا (South Asia) کہا جاتا ہے۔

اس علاقہ میں ہندستان، پاکستان، سری لنکا، عرب اور افغانستان شمار کئے جاتے ہیں۔ افغانستان سے میرا تعلق، ایک اعتبار سے خاندانی ہے۔ میرے مورث اعلیٰ احسن خاں مرحوم ایک افغانی پٹھان تھے۔ جو غالباً ۱۵ویں صدی عیسوی میں اپنا وطن چھوڑ کر ہندستان چلے آئے۔ اس زمانہ میں افغانستان کے مہم جو افراد اکثر ہندستان کا رخ کیا کرتے تھے۔

حسن خاں مرحوم چترال کے رہنے والے تھے۔ چترال کا علاقہ پہلی صدی قبل مسیح میں چینیوں نے فتح کیا۔ ۱۱ویں صدی عیسوی میں یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ علاقہ پہلے افغانستان کا حصہ تھا۔ ۱۸۸۹ء میں وہ انگریزوں کی ماتحتی میں آیا۔ ۱۹۴۷ سے وہ پاکستان کا حصہ ہے۔

ایک افغانی جرنلسٹ مسٹر سرور سے میں نے کہا کہ میرے افغانی مورث اعلیٰ افغانستان کو چھوڑ کر جونپور (ہندستان) گئے۔ اس وقت وہاں ایک افغان (سلطان شرقی) کی حکومت تھی۔ میرے مورث اعلیٰ کھیتا سرائے کے جنگل میں پہنچے تو وہاں ایک شیر سامنے آگیا۔ ان کے پاس اس وقت صرف ایک تلوار تھی۔ اس تلوار سے انھوں نے شیر کا مقابلہ کیا اور اس کو مار ڈالا۔ ان کی اس بہادری کی خبر سلطان شرقی تک پہنچی تو اس نے ان کو اپنے دربار میں بلایا اور اس علاقہ میں انھیں جاگیر عطا کی۔

میں نے سرور صاحب سے پوچھا کہ کیا اب بھی افغانستان میں ایسے لوگ ہیں جو تلوار کے ذریعہ شیر کو مار سکیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کا واقعہ بتایا کہ ایک بار جنگل میں ان کی مڈبھیڑ ایک شیر سے ہوگئی۔ اس وقت ان کے پاس ایک بڑی چھری تھی۔ اسی چھری سے انھوں نے شیر کو مار ڈالا۔ اگرچہ اس مقابلہ میں وہ خود بھی کافی زخمی ہوئے۔

پٹھانوں (افغانی باشندوں) کی تصویر قدیم زمانہ میں "طاقتور بیوقوف" کی تھی۔ پٹھانوں کی بیوقوفی کے بارہ میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ مثلاً ایک پٹھان کی کسی نے دعوت کی اور اس میں اسے برفی کھلائی۔ پٹھان کو برفی پسند آگئی۔ وہ بازار میں نکلا تو چاہا کہ مزید برفی حاصل کرے۔ ایک دکان پر سفید صابن کی ٹکیاں برائے فروخت رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے سمجھا کہ یہی برفی ہے اور اس کو خرید لیا۔ گھر پر لاکر کھانا شروع کیا تو وہ بہت بدمزہ تھیں۔ پٹھان منہ بگاڑ بگاڑ کر برفی کے ہم شکل صابن کو کھا رہا تھا۔ ایک شخص گزرا۔ اس کے بعد جو سوال و جواب ہوا وہ یہ تھا:

سوال: آغا چہ می خوری — جواب: پیسہ می خورم

شاید پٹھانوں کی اسی کمتر تصویر کا نتیجہ تھا کہ ہندستانی شاعر نے پٹھانوں کو "غسال" کے خانہ میں ڈال دیا۔ ہندستانی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی مغربیت پر طنز کرتے ہوئے اس نے کہا کہ دین سے ان کی دوری اور عدم واقفیت کا یہی انجام رہا تو آئندہ یہ حال ہوگا کہ :

آئیں گے غسال کابل سے کفن جاپان سے

تاہم موجودہ زمانہ میں روس کا افغانستان پر حملہ پٹھانوں کے لئے اس اعتبار سے مفید ثابت ہوا ہے کہ اس نے ان کی سابقہ تصویر بدل دی۔ پہلے اگر ان کی تصویر "طاقتور بے وقوف" کی تھی تو اب ان کی تصویر "طاقتور مجاہد" کی بن گئی ہے۔ اب وہ پوری مسلم دنیا میں ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

افغانوں کی بہادری مشہور ہے۔ یہاں بھی ان کی بہادری کے کئی قصے سننے میں آئے۔ میں نے ایک افغانی نوجوان آصف اللہ شمس (عمر ۳۰ سال) سے پوچھا کہ افغانی لوگ اتنے بہادر اور اتنے نڈر کیوں ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگوں کو بچپن سے اپنے گھر میں اور اپنے ماحول میں یہی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ کوئی افغان لڑکا یا کوئی افغان آدمی اگر بزدلی کی بات کرے تو فوراً اس کو یہ سننے کو ملے گا کہ تم بے غیرت ہو، تم کو شرم نہیں آتی کہ تم افغانی ہو اور تمہارے اندر افغانیت نہیں :

تو بی غیرت ہستی، نمی شرمی، افغان ہستی و افغانیت نداری۔

مسٹر سالم علی اور ایک انگریز عالم حیوانات کرنل مینرزاگن (R. Meinertzhagen) چڑیوں کے مطالعہ کے لئے ۱۹۳۵ میں افغانستان گئے۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ چند ہفتے وہاں مقیم رہے۔ وہ افغانی چڑیوں کی تلاش میں دور دور کے علاقوں میں نکل جاتے۔ سفر کے دوران اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنا کھانے پینے کا سامان راستہ پر یا سڑک کے کنارے رکھ دیتے اور اپنی دوربینوں کے ساتھ جنگلوں میں چلے جاتے یا پہاڑوں پر چڑھ جاتے۔ جب وہ لوگ اپنا کام کرکے واپس آتے تو وہ تعجب کے ساتھ پاتے کہ ان کا سامان بدستور اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ مکھیوں کے سوا کسی اور نے ان کو نہیں چھوا ہے :

Salim Ali, *The Fall of Sparrow*, 1987, p. 100.

یہ خصوصیت آج بھی افغانیوں میں موجود ہے۔ افغانی آج بھی ایک باکردار قوم ہیں تاہم اسی کے ساتھ جان غیر کو مارنا ان کے یہاں اتنا ہی جائز ہے جتنا کہ مال غیر کو لینا ناجائز۔

کابل شہر پہاڑوں کے درمیان آباد ہے۔ بلندی سے دیکھیں تو پورا شہر درختوں اور باغوں

کے جھرمٹ میں نظر آتا ہے۔" فطرت کی دنیا کتنی حسین ہے"۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا" مگر انسانی دنیا حسین نہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت" پابند" ہے اور اس کے مقابلہ میں انسان" آزاد" ہے۔ خدا کی دنیا میں اس کی مخلوقات کا حسن یہ ہے کہ وہ نظام خداوندی کی پابند بن کر رہے۔ فطرت اس کی مکمل پابندی کرتی ہے اس لئے وہ حسین ہے، انسان اس کی پابندی نہیں کرتا اس لئے وہ حسین نہیں۔

خدا نے چاہا کہ انسان کی صورت میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرے جو آزاد ہوتے ہوئے بطور خود اپنے آپ کو نظام خداوندی کا پابند بنالے۔ وہ آزادانہ پابندی والے حسن کا نمونہ پیش کرے۔ مگر انسان، کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر، اس خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ آزادی کے باوجود پابندی کا نمونہ اس نے پیش نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں درخت حسین ہے، مگر انسان حسین نہیں۔ ایک مفکر کے الفاظ میں: اس دنیا میں ہر چیز حسین ہے، مگر یہاں کی صرف ایک چیز حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔

۲۱ اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز یہاں کی مسجد" جامع وزیر محمد اکبر خاں" میں پڑھی۔ یہ مسجد یہاں کی سب سے خوبصورت مسجد بتائی جاتی ہے۔ خطبہ سے پہلے امام صاحب نے فارسی زبان میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے اس آیت سے آغاز کیا: کنتم خیر امة اخرجت للناس (شما امت بہتر است) انھوں نے کہا کہ امروز حقیت اسلام بہ دنیا واضح است (آج اسلام کی حقانیت دنیا پر واضح ہے) مگر ہم خود اسلام کے لئے نہیں اٹھتے۔ انھوں نے روتے ہوئے کہا کہ آج افغان عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں۔ بچے یتیم ہو رہے ہیں۔ گھر اجڑ رہے ہیں۔ کاروبار برباد ہو گئے۔ حالانکہ اسلام دین ترحم است۔ آخر میں انھوں نے رقت آمیز انداز میں یہ دعا کی:

خدایا اسلام را اتفاق نصیب کن، خدایا اسلام را برادری نصیب کن۔

مسجد میں ایک بات مجھے بہت پسند آئی کہ تمام لوگ صفوں میں مل کر بیٹھے۔ جب جماعت کھڑی ہوئی تو تمام صفیں بیک وقت کھڑی ہو گئیں۔ وہ صورت پیدا نہیں ہوئی جو دہلی میں نظر آتی ہے کہ جماعت کھڑی ہوتے ہی آگے آیئے، آگے آیئے، کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ جو بعض اوقات قرأت شروع ہونے تک جاری رہتی ہے۔ میرے اپنے تجربہ میں دہلی کا مسلمان سب سے زیادہ غیر منظم ہے۔ حتی کہ مسجد کی ہفتہ وار نماز میں بھی ایک ہی بے نظمی سالہا سال سے جاری ہے، اس میں کوئی کمی یا اصلاح نظر نہیں آتی۔

نماز سے فراغت کے بعد مسجد سے نکلے تو فقیروں کی جماعت دروازہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ ان میں بڑی

تعداد میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ان کے پھٹے کپڑوں اور میلے جسموں کے پیچھے خوبصورت افغان چہرے جھلک رہے تھے۔ تعلیم کی کمی اور معاشیات کی بربادی افغانستان میں اپنی آخری حد کو پہنچ رہی ہے۔ یہاں ہندستانی روپیہ چلتا ہے۔ ایک روپیہ پندرہ افغانی روپیہ کے برابر ہے۔ اس سے یہاں کی اقتصادی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مسجد کے دروازہ کے باہر ایک بوڑھا افغانی انار اور سیب بیچ رہا تھا۔ لکڑی کی پرانی گاڑی کے اوپر ایک طرف پھل تھے اور دوسری طرف ترازو اور اس کے ساتھ پتھر کے باٹ۔ گاہکوں کی آمد سے بے پروا ہو کر وہ ہاتھ میں تسبیح لئے کھڑا تھا اور "سیب لو سیب" یا "انار لو انار" جیسی آوازیں لگانے کے بجائے خاموش تسبیح خوانی میں مشغول تھا ——— افغانستان میں جہازوں کی گڑگڑاہٹ اور بم کے دھماکوں کے سوا مجھے زندگی ہر جگہ ٹھہری ہوئی نظر آئی۔

افغانستان میں پشتو اور دری، دو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایران میں جس زبان کو فارسی کہا جاتا ہے اس کو افغانستان میں دری کہتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ دری اور پشتو زبانیں ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور ایک دوسرے سے ملتی جلتی بھی۔ دو تقابلی فقرے سے اس فرق کو سمجھا جا سکتا ہے:

دری	پشتو
من چای می خورم	زہ چای خورم
من خانہ دارم	زہ کور لرم

کابل میں میرا قیام جس ہوٹل (روم ۳۲۸) میں تھا، اس کو مقامی لوگ اپنی زبان میں میلمہ پال ہوٹل کہتے ہیں۔ مگر اس نام کی بنا پر اس کو افغانی ہوٹل سمجھنا ایسا ہی ہوگا جیسے قاہرہ میں "نصر" کار کو دیکھ کر کوئی شخص سمجھے کہ یہ مصری صنعت کی بنائی ہوئی کار ہے۔ مسلم ملکوں میں بہت سی جدید چیزیں ہیں جن کے نام بظاہر مقامی مسلم زبان میں ہوتے ہیں، مگر حقیقۃً وہ خالص مغربی ہوتی ہیں۔

اس ہوٹل کا اصل نام "انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل" ہے۔ یہ دراصل مغربی سرمایہ کے تحت قائم شدہ ایک عالمی تجارتی تنظیم ہے جس کا رجسٹرڈ نام Inter-Continental Hotels ہے۔ اس کے تحت یروشلم سے لے کر نیویارک تک درجنوں شہروں میں ہوٹل قائم ہیں۔ اسی طرح ابوظبی، عمان، قاہرہ، دوبئی، اصفہان، کابل، مکہ، مسقط، ریاض، شارجہ، طائف، تہران، کراچی، لاہور وغیرہ

میں بھی اس کے ہوٹل چل رہے ہیں۔ "ہوٹل" اپنے جدید معنوں میں ایک زبردست انڈسٹری ہے اور موجودہ زمانہ کی دوسری انڈسٹری کی طرح مسلمان یہاں بھی بہت پیچھے ہیں۔

میرے کمرہ کے دروازہ پر دستک ہوئی۔ کھولا تو ایک افغانی عالم اندر داخل ہوئے۔ وہ روانی کے ساتھ عربی بول رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں عرب انداز کی تسبیح تھی جس پر مسلسل ان کی انگلیاں چل رہی تھیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ افغانستان میں مسلمانوں کا حال کیسا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر لحاظ سے بہت اچھا (عالی من جمیع الجہات)۔ انھوں نے بتایا کہ صرف کابل میں ۶۱۰ مسجدیں ہیں۔ البتہ دینی درس گاہ صرف ایک ہے۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر میں میں نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے اس طرح اپنا نام بتایا:

حجۃ الاسلام الشیخ محمد عوض صادقی، معین وزارۃ الشئون الدینیہ والاوقاف۔

ایک روز ناشتہ کی میز پر میرے ساتھ ایک افغانی بھائی بھی تھے۔ میز پر مختلف قسم کے کھانے کے سامان موجود تھے۔ اسی کے ساتھ ایک پیالہ میں شکر کے ڈلے تھے جو چائے میں ڈالنے کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے افغانی بھائی سے پوچھا کہ یہاں عام افغانی کا روزانہ ناشتہ کیا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت اپنی ڈبل روٹی میں مکھن لگا رہے تھے۔ وہ اچانک ٹھہر گئے۔ انھوں نے شکر کے پیالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: روٹی اور شکر۔

گفتگو کے دوران میں نے ان سے مزید پوچھا کہ افغانستان میں اتنی زیادہ جہالت ہے۔ افغانی لوگ اپنے بچوں کو پڑھاتے کیوں نہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ عام افغانی کو اپنی روٹی کے لئے اتنی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے کہ بچوں کو پڑھانا اس کے بس میں نہیں۔ افغانی لوگ بے حد محنتی ہوتے ہیں۔ ان کے پاس نہایت قیمتی زمینیں ہیں۔ اس کے باوجود افغانی قوم جہالت اور غربت کی شکار ہے۔ میری معلومات کے مطابق امیر امان اللہ خاں کے بعد یہاں کوئی قابل ذکر تعمیری کام نہیں ہوا۔

کابل میں میں ایک افغانی سے ملا۔ اس نے اپنا نام محمد سرور بتایا۔ وہ مجھ سے قطعاً واقف نہ تھا۔ حتی کہ اس نے میرا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ افغانی لوگ امیر امان اللہ خاں کے بارہ میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ امان اللہ خاں کے بارہ میں عام افغانیوں کی عین وہی رائے ہے جو خود میری رائے ہے۔ اس افغانی نے اپنی زبان میں کہا:

آزادی افغانستان توسط امان اللہ خاں غازی در سال ۱۹۱۹ تامین گردید۔ ومردم افغان اورا بہ دیدۂ قدرنی نگرند۔ وہیچ کس در افغانستان اورا بدنمی بنید۔ وودرراہ اعمار افغانستان اوبسیار کوشش زیاد نمودہ است۔

یعنی امان اللہ خاں کے ذریعہ ۱۹۱۹ میں آزادی حاصل ہوئی۔ افغانستان کے لوگ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افغانستان میں کوئی بھی شخص ان کو برا نہیں سمجھتا۔ افغانستان کی تعمیر کی راہ میں انھوں نے بہت زیادہ کوششیں کی ہیں۔

۲۴ اکتوبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر میرے ساتھ دو تعلیم یافتہ افغانی تھے۔ ایک نے اپنا نام راشد بتایا دوسرے نے کمال۔ میں نے ان سے امیر امان اللہ خاں کے بارہ میں پوچھا۔ دونوں نے ان کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ پھر ان کے زوال کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ یورپ گئے۔ وہاں انھوں نے جدید تعلیم کو دیکھا اور اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ واپس آئے تو انھوں نے چاہا کہ افغانستان میں اصلاحات کریں اور جدید تعلیم کو یہاں رائج کریں۔

انھوں نے کہا کہ "ملاؤں" کا طبقہ ان کے خلاف ہوگیا۔ افغانی علماء کی اکثریت ان کو کافر اور بے دین کہنے لگی۔ امیر امان اللہ خاں میں اتنی اعلیٰ خصوصیات تھیں کہ پھر بھی شاید ان کے مخالفین کامیاب نہ ہوتے۔ مگر امیر امان اللہ خاں کی ایک غلطی نے انھیں موقع دے دیا، اور وہ ان کی جلد بازی تھی۔ انھوں نے چاہا کہ جدید اصلاحات افغانستان میں فوراً نافذ ہو جائیں۔ مثلاً انھوں نے پہلے ہی مرحلہ میں کچھ افغانی لڑکیوں کو نرسنگ کی تعلیم کے لئے یورپ بھیج دیا۔ اس طرح کا کام اگر وہ رفتہ رفتہ کرتے تو کچھ نہ ہوتا، کیونکہ عوام ان سے خوش تھے۔ راشد صاحب نے بتایا کہ میری ماں نے امیر امان اللہ خاں کو دیکھا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ امان اللہ بہت اچھے اخلاق کے آدمی تھے۔ راستہ چلتے ہوئے بے تکلف عوام سے ملتے اور انھیں پیسہ اور تحفہ پیش کرتے۔ ہر ایک سے یکساں طور پر معاملہ کرتے۔

مگر اس وقت افغانی خاندانوں میں پردہ کا بہت شدت سے رواج تھا۔ جب انھوں نے افغانی لڑکیوں کو نرس کی ٹریننگ کے لئے یورپ بھیجا تو "ملاؤں" کو موقع مل گیا۔ انھوں نے ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اس وقت بھی امان اللہ خاں کی شرافت تھی کہ انھوں نے مخالفین کو دبانے کے لئے پولیس اور فوج کی طاقت استعمال نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خود اپنی قوم کے خلاف مار دھاڑ کریں۔ چنانچہ وہ

از خود ملک چھوڑ کر چلے گئے۔

امیر امان اللہ خاں نے ملکی اشیاء رواج دینے کی مہم چلائی۔ انھوں نے کہا کہ اپنے ملک کا کپڑا پہنو۔ اگر کوئی افغانی یا کوئی افسر بیرون ملک کے کپڑے پہنے ہوئے نظر آیا تو انھوں نے فوراً اس کے قریب جاکر اولاً اس کی تعریف کی اور پھر اپنی جیب سے چھوٹی قینچی نکال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا اور کہا کہ نمونہ گیریم (ہم تمہارے کپڑے کا ایک نمونہ لے رہے ہیں) اس طرح اس کے کپڑے کو برباد کر دیتے۔

امان اللہ خاں راتوں کو اکیلے گھومتے تھے۔ چوں کہ کابل میں رات کو اکیلے نکلنا منع تھا، ایک مرتبہ ایک سپاہی نے ان کو گرفتار کر لیا۔ تاہم امان اللہ خاں نے ناخوش ہونے کے بجائے اس کی فرض شناسی پر اس کو انعام دیا۔ امان اللہ خاں نے اپنے ملک میں تعلیم جاری کی۔ سائنس کی تعلیم کے لئے کچھ لڑکوں کو لندن بھیجا۔ ان افغانی طلبہ کے ساتھ انھوں نے ایک عالم بھی حکومت کے خرچ پر روانہ کیا۔ انھوں نے یہ تاکیدی ہدایت کی کہ ان کے اسکول کے عیسائی لڑکے جب چرچ جائیں تو افغانی لڑکے اس وقت قرآن کی تلاوت کریں (۹۴

امیر امان اللہ خاں ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۹ تک افغانستان کے حکمراں تھے۔ اس کے بعد ملک میں ان کے خلاف بغاوت ہوئی۔ یہاں تک کہ انھیں ملک چھوڑ کر باہر چلا جانا پڑا۔ اسی جلاوطنی کی حالت میں ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ کو زیورک میں ان کا انتقال ہو گیا۔

امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کرنے والوں کا خاص الزام ان کے اوپر یہ تھا کہ وہ خلاف شرع طریقے ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً وہ چاہتے تھے کہ افغان عورتیں گھر سے باہر نکل آئیں اور بے پردہ ہو کر مردوں کے ساتھ کام کریں۔

مگر یہی پٹھان تھے جنھوں نے اس سے تقریباً سو سال پہلے سید احمد شہید بریلوی کے معاملہ میں اس سے بالکل مختلف روش اختیار کی۔ سید صاحب نے پٹھانوں کے علاقہ میں اسلامی امارت قائم کی اور شرعی قوانین (زکوٰۃ وغیرہ کا قانون) جاری کیا۔ مگر پٹھانوں نے شرعی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی ——— امیر امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کو اگر دینی حمیت یا اسلامی جہاد کہا جائے تو سید صاحب کے خلاف بغاوت کو کیا نام دیا جائے گا۔

بیسویں صدی میں مسلم دنیا کو تین ایسے حکمراں ملے جو واقعی معنوں میں مدبر تھے اور دور جدید

کی حکومت کو چلانے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے ــــــ افغانستان کے امان اللہ خاں (۱۹۶۰ - ۱۸۹۲) اور سعودی عرب کے ملک فیصل (۱۹۷۵ - ۱۹۰۶) اور پاکستان کے محمد ایوب خاں (۱۹۷۴ - ۱۹۰۷) مگر تینوں حکمرانوں کو پوری طرح کام کرنے کے مواقع نہ مل سکے۔ ان تینوں کی قاتل، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، موجودہ زمانہ کی نام نہاد اسلامی سیاست تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس "اسلامی سیاست" سے اسلام کو جتنا نقصان پہنچا ہے اتنا کسی اور چیز سے اس کو نہیں پہنچا۔

بعض باتیں قومی امنگوں کے اعتبار سے بہت سنگین معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن انھیں باتوں کو اگر خالص حقیقت کے اعتبار سے جانچا جائے تو وہ بالکل مختلف نظر آئیں گی۔ مثال کے طور پر انگریز جب ہندستان پر قابض ہوئے تو وہ مسلسل یہ کوشش کرتے رہے کہ اپنی نوآبادیاتی سلطنت کو افغانستان تک وسیع کرسکیں۔ اس کا مقصد افغانستان پر قبضہ سے زیادہ روسی خطرہ کا دفاع تھا۔ مگر افغانیوں کی شدید مزاحمت کی وجہ سے انگریز اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہ ہوسکے۔

ہمارے پرجوش رہنما عام طور پر اس واقعہ کو اپنے اور افغانیوں کے فخر کے خانہ میں لکھے ہوئے ہیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو وہ صرف ایک پرجوش نادانی نظر آئے گی۔ انگریز کا معاملہ معروف معنوں میں صرف ایک "بیرونی سامراج" کا معاملہ نہ تھا۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ جدید تعلیم اور سائنٹفک انقلاب کے ہراول بن کر ایشیا میں داخل ہوئے تھے۔ نیز یہ کہ خود سائنسی انقلاب کی اپنی داخلی منطق کے تحت یہ بھی مقدر تھا کہ نوآبادیاتی اقتدار بالآخر ختم ہو اور قومی اقتدار اس کی جگہ لے لے۔

افغانی لوگوں کا جوش اگر ہوش کے تابع ہوتا اور وہ وقتی طور پر برطانیہ کی سرپرستی کو قبول کر لیتے تو اس کا انھیں زبردست فائدہ ملتا۔ برطانی اقتدار تو یقیناً اپنے وقت پر ختم ہو جاتا۔ مگر افغانستان کو اس "صبر" کی یہ قیمت ملتی کہ آج افغانستان ایک ترقی یافتہ ملک ہوتا نہ کہ ایک برباد شدہ ملک جیسا کہ آج وہ نظر آتا ہے۔

کانفرنس کا رسمی آغاز ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ کی صبح کو ہوا۔ اس کارروائی کو "پریس کانفرنس" کا نام دیا گیا تھا۔ مگر زیادہ صحیح طور پر وہ ایک ملاقات تھی۔ کیونکہ اس موقع پر جو کارروائی ہوئی وہ یہ تھی کہ افغانستان کی وزارت امور اسلامی کے ذمہ داروں نے افغانستان میں اسلام اور اسلامی تعلیم کی حالت کے بارہ میں معلومات بیان کیں۔

۱۔ ایسوسی ایشن فار ہیومن افیرز کے تحت ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ کو نئی دہلی میں ایک سیمنار ہوا۔ یہ سیمنار کانسٹی ٹیوشن کلب میں ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا :

Communalism: A threat to national unity

منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس سیمنار میں شرکت کی اور اس میں زیر بحث موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا۔ اس سیمنار میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔

۲۔ ایک کانفرنس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے بھوپال کا سفر کیا۔ وہاں ان کے متعدد خطابات ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳۔ صدر اسلامی مرکز کی کتاب (پرافٹ آف ریولیوشن) پر پاکستان کے بین اقوامی ایوارڈ کی خبر ۷ نومبر ۱۹۸۸ کو دہلی کے اخبارات نے شائع کی۔ اس کو دیکھ کر دہلی کے ایک انگریزی جرنلسٹ مسٹر ارن شرما نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو زیادہ تر مذکورہ کتاب سے متعلق سوالات پر مشتمل تھا۔ یہ انٹرویو بمبئی کے انگریزی روزنامہ ڈیلی (The Daily) میں ۶ نومبر ۱۹۸۸ کو شائع ہوا ہے۔

۴۔ امریکہ میں ۲۳-۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ کو ایک عالمی سیرت کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے امریکہ کا سفر کیا اور وہاں کے متعدد اجتماعات کو خطاب کیا۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۵۔ الرسالہ کے مندرجات نہ صرف اردو جرائد میں بلکہ انگریزی اخبارات میں بھی نقل کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام وسیع تر حلقہ میں پھیل رہا ہے۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کے انگریزی روزنامہ پائنیر کے شمارہ ۱۱ جون ۱۹۸۸ میں الرسالہ کے ایک مضمون کا خلاصہ بطور خبر حسب ذیل عنوان کے تحت شائع کیا گیا :

Muslim leader's plea for peace

۶۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : "غیر مسلم دوستوں میں تقسیم کرنے کے لیے الرسالہ انگریزی کی ایجنسی لینا چاہتا ہوں۔ گزارش ہے کہ انگریزی رسالہ کے پندرہ پرچے میرے نام ہر ماہ روانہ کریں"

(کرم حسین خاں، بمبئی) اسلام کے پیغام کی عمومی اشاعت کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کی پیروی کرنا چاہیے۔

۷۔ اعزاز مسعود صاحب (بھوپال) نے بتایا کہ ہانگ کانگ سے ایک خاتون مسز افروز افضل بھوپال آئیں۔ یہاں ان کو انگریزی الرسالہ کے کچھ شمارے دکھائے گیے۔ انھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور مستقل مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ اب وہ الرسالہ انگریزی کی خریدار ہیں اور ان کو برابر رسالہ جارہا ہے۔ اسی طرح ہر جگہ کے ساتھیوں کو کرنا چاہیے کہ باہر سے آنے والوں کو رسالہ دکھائیں اور اس سے متعارف کرائیں۔

۸۔ جناب محی الدین صاحب (بمبئی) نے بتایا کہ ان کے ایک صاحبزادے جس دفتر میں کام کرتے ہیں، وہاں کچھ کرسچین بھی کام کرتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ کرسچین نے ایک روز کہا کہ میں نے ایک انگریزی میگزین الرسالہ نام کا دیکھا جو دہلی سے نکلتا ہے۔ وہ مجھے پسند آیا۔ بتاؤ کہ بمبئی میں وہ کہاں سے ملے گا۔ اس کے بعد محی الدین صاحب کے صاحبزادے نے انگریزی رسالہ انھیں پہونچانا شروع کر دیا۔ خدا کے فضل سے اس طرح مختلف طریقوں سے الرسالہ لوگوں تک پہونچ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لے کر اسے لوگوں تک پہونچانے کی کوشش کریں۔

۹۔ جناب مشتاق احمد کریمی صاحب (مالدہ) الرسالہ کی ایجنسی چلاتے ہیں۔ وہ اپنے خط ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں: ماشاء اللہ (اردو) انگریزی الرسالہ اپنی مقبولیت میں اضافہ کر رہا ہے۔ اس اطراف کے لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ بعض لوگ عشق کی حد تک گرویدہ ہو گیے ہیں۔

۱۰۔ ایک صاحب اپنے خط ۴ نومبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں: اللہ اکبر اور اسلامی زندگی کا مطالعہ جاری ہے۔ بڑی لاجواب کتابیں ہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ دنیا میں کوئی اور کتاب نہیں جس کو بار بار پڑھنے سے بھی کبھی بیزاری محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن مجید کے بعد اگر کوئی ایسی کتاب ہے جو لاکھ بار پڑھنے سے اکتاہٹ نہ ہو تو وہ بس آپ کی تصنیفات ہیں۔

(نیر ربانی، بنگلور)

۱۱- ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں : الرسالہ کا میں اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ مہینہ کا انتظار رہتا ہے۔ آج تک میں نے کئی رسالوں کا مطالعہ کیا۔ لیکن یہ ایک ہی ایسا رسالہ ہے جس نے مجھ کو خرید لیا، میں اس کو خرید نہ سکا۔ میں بھی الرسالہ کی ایجنسی لے کر کار نبوت میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میرے نام ایجنسی شروع کر دیں۔ (ایاز فاروقی، امراؤتی)

۱۲- الرسالہ کے ایک قاری اپنا نام ظاہر کیے بغیر لکھتے ہیں : آپ کی عمر دراز ہو اور تندرستی کی دولت حاصل رہے۔ ماہ ستمبر کے الرسالہ میں حدیبیہ کی مثال دے کر معقول واپسی کی افادیت پر جو زور دیا ہے، اسے پڑھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ کسی فارسی شاعر نے کیا اچھا شعر کہا ہے :

اقلیمِ دل بزورِ مسخر نمی شود   ایں فتح بے شکست میسر نمی شود

کتنے نادان و ناعاقبت اندیش ہیں وہ لوگ جو اپنے نظریات کے فروغ کے لیے تلوار کا سہارا لینا چاہتے ہیں۔ کاش آپ کی باتوں پر ہمارے مسلمان بھائی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں۔

۱۳- مختلف ملکوں سے برابر ہمیں ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں یہ درج ہوتا ہے کہ الرسالہ ہمیں دیکھنے کو ملا اور بہت پسند آیا۔ اس کو ہمارے نام اعزازی طور پر جاری کر دیں مثلاً ماریشش سے مسز نسیم حسین کا خط مورخہ ۲۳ ستمبر، یوگنڈا سے مسٹر عمر داؤد کا خط مورخہ ۲۶ اگست، وغیرہ اسی طرح ملک کے اندر سے بھی الرسالہ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات کے بارہ میں خطوط موصول ہوتے ہیں کہ ہم فی الحال ان کی قیمت ادا نہیں کر سکتے مگر ہمیں ان کے مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ اس قسم کے بڑھتے ہوئے تقاضے کے پیش نظر رسالہ اور کتابوں کی بلا قیمت یا رعایتی قیمت پر فراہمی کے لیے ایک سبسڈی فنڈ قائم کیا جارہا ہے۔ جو لوگ اس فنڈ میں حصہ لینا چاہیں وہ اپنی رقم روانہ فرمائیں۔ چک یا ڈرافٹ کے ذریعہ رقم بھیجنے والے اس کے اوپر اکاونٹ کا نام اس طرح لکھیں : Al-Risala Subsidy Fund

۱۴- ایک صاحب اپنے خط ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں : الرسالہ کا ہر شمارہ عجیب سی کیفیت پیدا کرتا ہے جسے الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنجناب کو قوم کی رہنمائی کے لیے چن لیا ہے۔ (پروفیسر کلیم احمد۔ ریوا)

۱۵- الرسالہ کے مختلف حلقے اپنے یہاں کی خبریں روانہ فرمائیں تاکہ ان کو خبرنامہ میں شامل کیا جا سکے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں، پرنٹر پبلشر مسئول نے وجئیا آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 February 1989 No 147

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳